بھی ان کی مجلس سے دور نہ ہوتے اور کبھی کبھی ''حلقہ یاراں میں ابریشم کی طرح نرم'' ہو کر آ بیٹھتے۔

صاحبزادہ جمیل احمد شرقپوری صاحب نے خانوادہ شرقپور کے فرد ہونے کے ساتھ ساتھ میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی فیضان کو عام کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ وہ حضرت مجدد الف ثانی کے سلسلہ طریقت کو لے کر پاکستان کے گوشے گوشے میں پہنچے اور لوگوں کو ''سلسلہ نقشبندیہ'' کی تربیت دی۔ آپ نے ایک ماہانہ رسالہ ''نور اسلام'' جاری کیا جس سے حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات پھیلانے میں بڑا کامیاب تجربہ کیا۔ اس ماہنامہ کے کئی نمبر ''سلسلہ نقشبندیہ'' کے طریقہ اور نظریات کا مرقع بن کر سامنے آئے اور صاحبزادہ جمیل احمد شرقپوری نے اپنی نگرانی میں اہل علم وقلم کی جو ٹیم تیار کی تھی، اس سے بڑا کام لیا اور لوگوں کے لیے حضرت مجدد کے افکار کی اشاعت کی کامیاب کوشش کی۔ ''نور اسلام'' کی تحریروں کے علاوہ صاحبزادہ جمیل احمد شرقپوری نے ''یوم مجدد'' کے ایک روحانی سلسلے کو رواج دیا۔ انہوں نے حضرت مجدد الف ثانی کی یاد میں پاکستان کے تمام شہروں میں ''یوم مجدد'' منانے کا اہتمام کیا۔ میں نہ تو صاحبزادہ کی قلمی ٹیم کا رکن بن سکا، نہ تقریری علماء کا ہم سفر بن سکا۔ ان کی ان ساری روحانی عظمتوں کے باوجود میں ان کے روحانی حلقہ میں بھی شامل نہ ہو سکا۔ مگر میاں جمیل احمد شرقپوری نے نہ مجھے کبھی نظر انداز کیا اور نہ نظر التفات سے محروم کیا۔

ایک وقت آیا کہ میاں جمیل احمد شرقپوری پاکستان کی سرحدوں سے نکل کر مختلف اسلامی ممالک اور یورپ کے ان علاقوں میں جا پہنچے، جہاں جہاں ان کے عقیدت مند رہتے تھے۔ آپ نے ان ممالک میں عام پیروں کے رویہ کے برعکس چندہ اکٹھا کرنے کی بجائے ''سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ'' کے مراکز قائم کیے۔ پھر وہ دنیا بھر کے نقشبندی مشاہیر سے ملاقات کے لیے نکلے۔ نقشبندی بزرگوں کے مزارات اور

خانقاہوں پر پہنچے۔ اس طرح انہوں نے نقشبندی سلسلہ تصوف کی ان کڑیوں کو منظم کرنے کی کوشش کی جو یک جان ہوتے ہوئے بھی بکھری پڑی تھیں۔

صاحبزادہ میاں جمیل احمد صاحب شرقپوری ایک طرف ایک کامیاب ''پیر ہیں، تو دوسری طرف ان کے حلقہ میں علماء کرام، دانشور، شعراء اور اہل قلم حضرات کی ایک خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔ حالانکہ آج کل کے مشائخ، اہل علم کو اپنے حلقہ سے دور ہی رکھتے ہیں۔ ان کا دستر خوان کھلا ہے۔ اگر میں کھلا کی بجائے ''وسیع'' کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ وہ اہل علم وفضل کو گھر بلا کر صرف میزبانی ہی نہیں کرتے، بلکہ ان کے پاس پہنچ کر انہیں اپنا مہمان بنانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ وہ جمعیۃ علماء پاکستان سے وابستہ ہوئے تو قید و بند کو لبیک کہتے رہے۔ انتخابی میدان میں نکلے تو اپنے مخالفین کو پسینہ پسینہ کر دیا۔

آج وہ ''افضل المشائخ'' ہیں۔ پیر طریقت ہیں۔ شرقپور شریف کے دربار عالیہ کے سجادہ نشین ہیں۔ ان کے صاحبزادوں میں سے ایک پیر ہیں۔ ایک ضلع ناظم شیخوپورہ ہیں۔ ایک دانشور ہیں۔ مگر ان تمام بلندیوں کے باوجود وہ ہم جیسے فقیروں کو اپنی محبت سے نوازتے رہتے ہیں اور اپنے بلند مقامات کی رعونت کی گرمی دور افتادہ اور گمنام لوگوں پر نہیں پڑنے دیتے۔

ایسے درویشوں کی اے اہل جہاں قدر کرو
ایسے درویشوں کا تاریخ میں نام آتا ہے

مولانا علم الدین جہلمی:

پاکستان بننے سے پہلے لاہور بہت چھوٹا سا شہر تھا۔ اس کے مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی ملا کر بہت کم آبادی تھی۔ سارے شہر کی ''سبزی منڈی'' گوالمنڈی کے چوک میں تھی۔ اور ''میوہ منڈی'' فلیمنگ روڈ پر برف خانہ چوک میں تھی۔ اس میوہ منڈی کی جامع مسجد کے ایک خطیب مولانا علم الدین تھے جو جہلم سے آ کر اپنی پر جوش تقریروں

کی وجہ سے بڑے معروف ہوئے۔ وہ مولانا محمد نبی بخش حلوائی کے مدرسہ ''ستی کوتوال'' میں آتے اور حضرت مولانا سے مسائل اسلامیہ پر گفتگو کرتے تھے۔ اس طرح سب طالب علموں کے محبوب عالم دین بن گئے۔ ہم بھی ان کی تقریر سننے میوہ منڈی پہنچتے تھے۔ مولانا علم دین، علامہ عنایت اللہ المشرقی کی عسکری تحریک سے بڑے متاثر تھے۔ وہ علامہ صاحب سے نظریاتی اختلاف کے باوجود خاکساروں کی صفوں میں کھڑے ہوتے اور ''چپ وراست'' بھی کرتے۔ ان کے ایک دوست، پروفیسر مولانا عبدالحمید جو جہلم سے آئے تھے، خاکسار تحریک کے ہمنوا تھے۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن کے ساتھ ''آسٹریلیا مسجد'' میں شعلہ بار تقریر کرتے۔ لاہور اور لاہور میں آنے جانے والے نمازیوں کو گرما دیتے۔ اس زمانہ میں ''آسٹریلیا مسجد'' ایک بڑی مسجد شمار ہوتی تھی۔ اور پروفیسر عبدالحمید مرحوم کی تقریروں نے اسے پرجوم بنادیا تھا۔ مولانا علم الدین مرحوم، پروفیسر عبدالحمید کے پرجوش بیان سے اتنے ہی متاثر تھے، جتنے ہم لوگ مولانا کی جوشیلی تقریروں کے شیدائی تھے۔ نواب آف ممدوٹ نے مولانا کی تقاریر سنیں تو انہیں لاہور سے اپنی ریاست ممدوٹ میں لے گئے۔ چنانچہ جلال آباد ممدوٹ پہنچ کر مولانا علم الدین نے نہ صرف تقریر وخطاب سے لوگوں کو متاثر کیا بلکہ وہاں ایک دارالعلوم قائم کیا۔ حافظ محمد عالم سیالکوٹی اور راقم الحروف ان کے مدرسہ میں گئے۔ چند روز زیرِ تعلیم بھی رہے مگر محمد عالم سیالکوٹی صاحب چونکہ تیز رفتاری سے تعلیم کی منزلیں طے کرنا چاہتے تھے، وہاں کے مدرسین کی سست رفتار گاڑی سے تنگ آکر لاہور آگئے۔

پاکستان بنا۔ ''ریاست ممدوٹ'' ہندوستان کے حصہ میں آئی تو مولانا علم الدین بھی مہاجر بن کر پاکستان آگئے۔ نواب آف ممدوٹ نے کئی بار انہیں فرمایا، مولانا آپ مہاجر ہیں کچھ زمین مکان الاٹ کرالیں۔ مگر مولانا علم دین فرمایا کرتے تھے۔ ''اصلی مہاجر'' نہیں ہوں اور اس طرح اس وقت کی لوٹ کھسوٹ سے تہی دامن رہے۔ ان دنوں ''دریائے جہلم'' اپنی موجوں پر بڑا نازاں ہوکر بہتا تھا۔ اس کے دائیں کنارے

پر ایک بڑی خوبصورت مسجد ''ملاحان'' تھی۔ مولانا اس میں نماز جمعہ پڑھانے لگے اور ایک عرصہ وہاں خطابت کرتے رہے۔

پاکستان بننے کے بعد راقم الحروف محکمہ صنعت پنجاب میں انڈسٹریل ڈویلپمنٹ آفیسر بن کر جہلم شہر کے دورے پر گیا، تو مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے مولانا کو تنگ دست پایا۔ تنخواہ تھوڑی۔ اہل وعیال کے اخراجات زیادہ تھے۔ مولانا سادہ لوح، سادہ روش اور ہیر پھیر سے محفوظ ذہن کے مالک تھے۔ میں نے دیکھا کہ مولانا کی مسجد کے اردگرد شہتوتوں کے درخت قطار در قطار کھڑے ہیں۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ اگر آپ کے بچے فارغ وقت میں ریشم کے کیڑے پال کر ریشم تیار کرلیا کریں تو آپ کو اچھی آمدنی ہوجایا کرے گی۔ ان دنوں ریشم کے کیڑے پالنے اور ریشم کی تیاری پر ''محکمہ صنعت پنجاب'' کا کنٹرول تھا۔ مولانا کو ریشم کے کیڑوں کے انڈے لے دیے۔ مولانا کے بچے ان انڈوں کو چارپائیوں پر بکھیر دیتے اور شہتوت کے پتے کتر کتر کران کے آگے ڈال دیتے۔ بس چند ہفتوں میں ریشم کے یہ کیڑے شہتوت کے پتوں پر پل کر جوان ہوجاتے اور اپنے منہ سے ریشم اگلنے لگتے اور مولانا ریشم کی ٹوکریاں بھر کر لاہور لے آتے اور بیچ کر اپنا محنتانہ حاصل کرتے۔ انہوں نے یہ کام کئی سال کیا۔ امیر تو نہ بن سکے مگر گزر اوقات میں سہولت ہوگئی۔

اس عرصہ میں مولانا لاہور ضرور آتے۔ مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ان کے مدرسہ میں ہی آکر قیام کرتے۔ طلبہ میں بیٹھ کر علم کی باتیں کرتے۔ ریشم پیدا کرنے کے باوجود ان کا بدن کھدر کے سادہ لباس میں ہی سجتا۔ نواب آف ممدوٹ سے مراسم ہونے کے باوجود ان سے صرف چائے کی پیالی ہی پیتے اور گھر چلے آتے۔ امراء اور روساء وقت کے سامنے کلمہ حق ہی بیان کرتے۔ جھولی پھیلا کر ''دے دے میرے داتا سخی نام خدا'' کا نعرہ کبھی نہ لگایا۔ غربت کی المناک کہانی سناتے۔ مگر امراء اور وزراء سے اپنی غربت کا علاج نہ کراتے۔ کاش وہ آج زندہ

ہوتے تو میں ''زکات العلوم'' کا ادارہ قائم کرنے کا انہیں مشورہ دیتا۔

کروں مدح اہلِ دول ''رضا'' پڑے اس بلا میں میری بلا
میں گدا ہوں اپنے کریم کا میرا دین پارۂ ناں نہیں

مولانا عبدالقیوم ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ (م۔۲۰۰۳-۸-۲۸):

مولوی عبدالقیوم ہزاروی مرحوم ''دارالعلوم حزب الاحناف'' سے دستارِ فضیلت لے کر نکلے تو شیرانوالے دروازے کے باہر باغ میں ایک چھوٹی سی مسجد میں جمعہ پڑھانے لگے۔ یہ مسجد مولوی احمد علی لاہوری کی مسجد کے قریب تھی۔ حضرت سید ابوالبرکات کا یہ شاگرد دیوبندیوں کے اتنے بڑے مرکز کے سامنے کھڑے ہو کر خطاب کرتا۔ نوجوان تھا۔ لوگوں کو اس کی پرجوش باتیں پسند آنے لگیں۔ ان کے استاد مولانا ابوالبرکات سید احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ ان کی حوصلہ افزائی کیلئے ''جمعۃ الوداع'' اور ''عیدین'' کا خطبہ خود پہنچ کر وہاں ہی دیتے۔ مولوی عبدالقیوم ہزاروی مرحوم ثابت قدم رہے۔ مسجد آہستہ آہستہ اپنا دامن پھیلاتی رہی۔ سختیاں آئیں، پریشانیاں آئیں، دیوبندیوں کی یلغاریں آئیں مگر وہ اپنی مسجد میں قائم و دائم رہے۔ لاہور کے کچھ غنڈے اور کارپوریشن کے کچھ کارندے بھی انہیں پریشان کرتے رہے مگر وہ ڈٹے رہے۔ ایک عرصہ تک قائم و دائم رہے۔ بلکہ تاحیات اپنا مصلی و محراب نہیں چھوڑا۔ فوت ہوئے تو آج ان کی پرانی مسجد خراسیاں کو شہید کر کے لاہور کا ایک متمول آدمی شاندار مسجد بنانے میں مصروف ہے۔ سنا ہے وہ ایک کروڑ روپیہ تک لگانے کا تہیہ کر چکا ہے۔

شدیم خاک و لیکن زبوئے تربت ما
تواں شناخت کہ زیں خاک مردی خیزد!

قاری صدرالدین رحمۃ اللہ علیہ:

لاہور کے علماء کرام کی یادوں میں اپنے ایک بے مثال دوست حافظ قاری صدر الدین مرحوم کو بھلا دینا بڑی ہی بے ذوقی ہوگی۔ حافظ صدرالدین نابینا تھے۔ ریاست

بٹالہ (انڈیا) میں جنم لیا تو بچپن میں ہی لاہور آ گئے۔ قرآن پاک حفظ کیا۔ عبادات میں ریاضت، چلہ کشی، ضبطِ دم اور حبسِ دم کے مراحل سے گزرے۔ مولانا تاج الدین مرحوم کی مسجد کے امام مقرر ہوئے۔ یہ مسجد، جامع مسجد وزیر خان کے پہلو میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ جہاں مولوی تاج الدین رحمۃ اللہ علیہ مسندِ ارشاد بچھائے اہلِ لاہور کو علم و فضل سے حصہ دیتے رہے تھے۔ یہ مسجد کبھی جنات کا مسکن تھا۔ مگر مولوی تاج الدین سے بعد از مزاحمت بسیار جنات کو اپنا ٹھکانہ بدلنا پڑا۔

قاری صدرالدین نے اس مسجد کی رونق کو نہ صرف دوبالا کیا بلکہ اس میں حفظ و ناظرہ کا درس جاری کیا۔ پھر ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری کیا۔ قاری صدرالدین نابینا تھے مگر بلا کی ذہانت اور محنت لے کر آئے تھے۔ وہ دن کو بچوں کو قرآن حفظ کراتے۔ رات بھر بجلی کا کام کرتے۔ نابینا ہونے کے باوجود مسجد میں بجلی کے پنکھوں کو درست کرنا، مرمت کرنا، حتیٰ کہ وائرنگ کرنا ان کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

مسجد کی ساری بجلی کا نظام ان کے اپنے حجرے میں ہوتا۔ برقی روان کے قبضہ میں ہوتی۔ ساری رات بجلی کے آلات سے پنکھے، ٹیوبیں، بلب لگاتے اور وائرنگ درست کرتے۔ صبح نمازی آتے تو آپ مصلے پر کھڑے ہو کر امامت کراتے۔ پاکستان بنا تو انہوں نے ریڈیو ٹرانسسٹر بنانے میں مہارت حاصل کر لی۔ ان دنوں ریڈیو کسی کسی کے پاس ہوتا تھا۔ قاری صاحب ٹرانسسٹر تیار کرتے، بیٹری اور بجلی کے بغیر ہی ایسے ٹرانسسٹر کام کرتے۔ لنڈے سے ملٹری کے فارغ شدہ ہیڈ فون لے آتے اور پھر اگالدان کی ڈبیہ میں ٹرانسسٹر تیار کر کے احباب کو دیتے۔ نہ بجلی کی ضرورت نہ بیٹری کی حاجت۔

قاری صاحب کے ایک ساتھی صوفی محمد اسمٰعیل مرحوم تھے۔ جو ایک زاہد و عابد درویش تھے۔ وہ کہاں سے آئے، کہاں کے رہنے والے تھے، دوستی کے باوجود کبھی انہوں نے اپنا اتا پتا بتانے کا تکلف نہیں کیا۔ ہم کبھی انہیں سی آئی ڈی کا آدمی سمجھتے کبھی

جنات کی بقیہ ہستی قرار دیتے۔ مگر صوفی صاحب ہمارے ہر خدشے کو ایک مسکراہٹ سے ٹال جاتے۔ وہ عمر بھر قاری صدر الدین کی نابینائی کی روشنی بنے رہے۔ قاری صاحب کی تدریسی شہرت پھیلی تو قیام پاکستان کے بعد امرتسر سے آئے ہوئے قاری فضل کریم صاحب نے موتی مسجد لاہور میں حفظ قرأت کا مدرسہ قائم کیا۔ تو قاری صاحب کو تدریسی کام کے لیے مقرر کر دیا۔ قاری صاحب نے کئی سال تک اس دار العلوم کے ابتدائی دور میں قاری فضل کریم صاحب کا ساتھ دیا۔ اگرچہ قاری فضل کریم صاحب دیوبندی تھے مگر قاری صدر الدین مرحوم کی وجہ سے کئی سال تک مجھے تقسیم اسناد کے جلسوں میں تقریر کرنے کا موقع ملتا رہا۔ اور فارغ ہونے والے حفاظ کے سروں پر پگڑیاں (دستار فضیلت) میرے ہاتھ سے باندھی جایا کرتی تھیں۔ قاری صدر الدین کو میری علمی خدمات کی بڑی قدر تھی۔ میں انہیں انگریزی کی نصابی کتابیں ایک بار سناتا تو ان کے حافظہ پر لفظ لفظ نقش ہو جاتا۔ پھر وہ طلبہ کو انگریزی کی تعلیم دیتے۔ میں انگریزی سنا کر بھول جاتا تو وہ میری اغلاط کو بھی درست کرتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ مجھے انگریزی الفاظ کے ہجا میں غلطی ہوتی تو قاری صاحب درست فرماتے۔ قاری صدر الدین مرحوم نے ساری زندگی درس و تدریس میں گزار دی۔ بینائی سے محروم ہونے کے باوجود کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ آج کے علماء جب کاسہ گدائی لے کر نکلتے ہیں تو مجھے حافظ صدر الدین مرحوم کی خودداری یاد آتی ہے۔ ان کے ایک بھائی پروفیسر ملک نور الدین تھے (غالباً ابھی زندہ ہیں) وہ محکمہ تعلیم میں پروفیسر اور بعد میں بہت بڑے آفیسر بن کر ریٹائر ہوئے تھے۔ وہ کبھی کبھی اپنے بھائی کو ملنے آتے۔ مگر قاری صدر الدین نے ان کی معاشی راحتوں سے کبھی حصہ نہیں لیا۔

قاری عبدالغفور ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ:

مولانا قاری عبدالغفور ہزاروی مرحوم اپنے زمانے کے بڑے بلند آواز اور پر جوش قاری تھے۔ وہ یکی دروازے کے اندر ایک چھوٹی سی مسجد کے امام تھے۔ میں جن دنوں

جمعہ کے اجتماع میں تقریر کیا کرتا تھا، تو وہ میری درخواست پر جمعہ کی نماز کی امامت کراتے۔ ان کی قرأت سے لوگوں کی نکاہت دور ہو جاتی اور دل وجد سے جھوم اٹھتے۔ انھوں نے میرے ساتھ جو وقت گزارا نہ کبھی مالی توقع رکھی، نہ میں نے انہیں کبھی کچھ دیا اور نہ ان کے چہرے اور زبان پر کبھی "حرفِ مدعا" آیا۔ آج میں چھوٹے چھوٹے قاریوں کو قرآن سنانے کا صلہ طلب کرتے پھر اس پر اصرار کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے احباب کی بے نیازی کی روشنیاں ڈھانپ لیتی ہیں۔

مولانا سلیم اللہ رحمۃ اللہ علیہ:

قیامِ پاکستان کے کچھ عرصہ پہلے "دار العلوم حزب الاحناف" کے فارغ التحصیل ایک نوجوان عالم دین نے "مصری شاہ" کی "سفید مسجد" کو اپنا مرکز بنایا۔ یہ نوجوان عالم دین، مولانا سلیم اللہ صاحب تھے، جنہوں نے اپنی تقریر و خطابت سے لوگوں کو متاثر کیا۔ ان کی تقریر سننے کے لیے لوگ دور دور سے کھنچے چلے آتے۔ مسجد کا صحن اور چھتیں سامعین سے بھر جاتیں۔ وہ خطاب بھی کرتے اور مختلف اوقات میں دینی تقریبات کا اہتمام بھی کرتے۔ اس طرح ان کی مسجد لاہور کی مشہور مسجد شمار ہونے لگی۔ اس عالم دین کو محراب و منبر سے ہٹ کر عملی زندگی میں کام کرنے کا بڑا جوش تھا۔ یہ مسلم لیگ کے ساتھ اس وقت وابستہ ہو گئے جب مسلم لیگ کو لیڈروں کے علاوہ نوجوانوں کی ضرورت تھی۔ مولانا سلیم اللہ مسجد کے محراب و منبر سے نکل کر سبز وردی زیب تن کرتے اور مسلم لیگ کا جھنڈا اٹھائے "مسلم نیشنل گارڈ" کی قیادت کرتے۔ ان دنوں قائداعظم لاہور تشریف لاتے تو میاں ممتاز دولتانہ، نواب آف ممدوٹ اور سردار شوکت حیات خاں جیسے نامور مسلم لیگی لیڈران کے ساتھ ہوتے، مولانا سلیم اللہ ان دنوں "مسلم نیشنل گارڈ لاہور" کے شمالی ونگ کے سالار تھے۔ ان دنوں مسلم لیگ کو خاکی وردیوں میں خاکسار بیلچہ اٹھائے تنگ کرتے "احرار" سرخ وردیوں میں کلہاڑیاں اٹھائے ڈراتے، سکھوں کے اکالی نیلے لباس میں اپنی کرپانوں اور کڑوں کو لہراتے، پھر کانگرس کے ہندو نوجوان

بھی مسلم لیگ دانت پر پیستے دکھائی دیتے۔ ان حالات میں مولانا سلیم اللہ اپنے سبز پو جیش کو لے کر نکلتے تو لوگ دیکھتے رہ جاتے۔ تحریکِ پاکستان میں تشدد کا تو پکڑ دھ شروع ہوئی۔ آنسو گیس اور لاٹھی چارج برسنے لگے۔ مولانا سلیم اللہ ان تمام حملوں کی ز میں ہوتے۔ خضر حکومت نے جب ایسے سبز پوش نوجوانوں کو گرفتار کر کے جیل میں پھ تو حکم دیا کہ ان سبز پوشوں کو بید اور کوڑے مارے جائیں۔ مولانا سلیم اللہ نے تو کبھی ذ نہیں کیا۔ مگر ان کے ساتھ کوڑے کھانے والے ساتھی بتاتے ہیں کہ مولانا سلیم اللہ جس قدر کوڑے برسائے گئے تھے اگر یہ پیپلز پارٹی کے جیالے ہوتے تو آج نیوگار ٹاؤن لاہور میں چار کمرشل پلاٹوں کے مالک ہوتے۔ افسوس مسلم لیگی اقتدار نے ایسے لوگوں کو کبھی نہیں نوازا اور مولانا سلیم اللہ اپنی زندگی کے کئی سال سفید مسجد میں قال اللہ اور قال الرسول کی دولت کے مالک بنے رہے۔ کچھ عرصہ بعد جب انہیں فکر معاش نے آ گھیرا تو وہ امامت و خطابت کے ساتھ ساتھ پرانے لوہے کا کاروبار کرنے لگے۔ ان کی اس مصروفیت نے انہیں علمی اور دینی مصروفیات سے دور ہٹا دیا اور وہ محراب و منبر جو ان کی للکار سے گونجا کرتے تھے خاموش ہو گئے۔

نہ وہ ''غزنوی'' میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے ''زلفِ ایاز'' میں!

قاری محمد طفیل امرتسری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۹۸۹ء):

قاری محمد طفیل امرتسری قیامِ پاکستان کے بعد امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور گئے اور لاہور کے دل ''مسجد وزیر خان'' میں مسندِ تدریس قرآن بچھا دی۔ وہ بڑے خوش آواز، بلند آواز اور شیریں زبان قاری تھے۔ ان کی قرآن خوانی نے لاہور کے اہلِ دل کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ قرآن کی تلاوت کرتے تو مسجد کے در و دیوار معمور ہو جاتے۔ ان دنوں لاؤڈ اسپیکر کا رواج نہیں تھا مگر قاری محمد طفیل کی آواز منت پذ لاؤڈ اسپیکر نہ تھی۔ وہ قرآن پڑھتے تو ساری مسجد گونج اٹھتی۔ لوگ جوق در جوق آ لگے۔ وہ اپنی فنی بلندیوں کے باوجود خلیق اور خوش گفتار تھے۔ وہ ایک عرصہ ''مسجد وز

مان'' کی رونق بنے رہے۔ ہم رمضان المبارک کی روحانی راتوں کو اپنی اپنی مساجد میں تراویح پڑھ کر مسجد وزیر خان جاتے تو قاری طفیل مرحوم کی آواز سے دلوں کو سکون ملتا۔ وہ رات گئے تک مصلی سناتے اور نمازی اکتانے کا نام نہ لیتے۔ ان کے شاگردوں کا ایک خاصہ حلقہ آج بھی لاہور ہی نہیں پنجاب کے مختلف شہروں میں موجود ہے۔ کچھ عرصہ بعد وہ لاہور کو چھوڑ کر حیدرآباد سندھ چلے گئے اور زندگی کے آخری سانس تک قرآن کی تدریس و تعلیم میں مشغول رہے۔ اگرچہ وہ کام کرتے رہے مگر جو گونج ان کی لاہور کی مسجد وزیر خان میں تھی وہ پھر کبھی سننے میں نہ آئی۔

ع اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب!

خطیبِ اعظم مولانا غلام محمد ترنم رحمۃ اللہ علیہ (م: ۵۹-۷-۲۴):

مولانا غلام محمد ترنم مرحوم کا ذکر ''ذکرِ خیر'' سے کم نہیں۔ وہ امرتسر کے ایک باکمال خطیب اور مقرر تھے۔ پاکستان بننے کے بعد لاہور آئے تو لاہور کے کوچہ و بازار ان کی للکار سے گونج اٹھے۔ وہ ''بزمِ غالب'' کی سٹیج پر گوالمنڈی کے چوک میں تقریر کرتے تو چاروں بازار حدِ نگاہ تک سامعین سے اٹ جاتے۔ ان کا زورِ بیان، مترنم آواز اور پُر زور تقریر اہلِ ذوق کو لوٹ لیتی۔ جس سٹیج پر کھڑے ہوتے چھا جاتے۔ اپنے تو اپنے غیر بھی ان کی خوش بیانی کی تعریف کرتے۔ وہ پنجاب سیکرٹریٹ کی ایک چھوٹی سی مسجد میں خطبہ جمعہ دینے لگے تو سیکرٹریٹ کے ملازمین سے نمازیوں کی تعداد زیادہ بڑھ گئی۔ مسجد کا دامن تنگ تھا، نمازی زیادہ ہوتے گئے۔ مسجد پھیلنے لگی، محراب و منبر گونجنے لگے تو پنجاب گورنمنٹ کو ہوش آیا۔ مسجد کی تعمیرِ نو شروع ہوئی تو ایک بہت بڑی مسجد بن گئی۔ مولانا غلام محمد ترنم مرحوم کے بعد یہ مسجد روایتی مولویوں کے ہاتھوں میں آ گئی تو آج ان کے در و دیوار مولانا ترنم کی آواز کو ترستے ہیں۔

وہ مسجد روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب!

مولانا ترنم صاحب کبھی کبھی مجھ پر کرم فرمائی کرتے۔ تقریر و خطاب کے زیر و بم سے آگاہ کرتے اور ایسے بلا تکلف انداز میں ذہنی اور لسانی تربیت کر جاتے کہ محسوس بھی نہ ہوتا کہ مولانا غلطی درست کر رہے ہیں یا تربیت دے رہے ہیں۔ وہ سادہ لباس، سادہ رہائش اور سادہ زندگی کے خوگر تھے۔ علم و خطاب کی بلندیوں کے باوجود ہر ایک کے ساتھ اس کی ذہنی سطح پر بات کرتے اور ذہنی راہنمائی فرماتے۔

مولانا غلام معین الدین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۷-۸-۱۴):

مولانا غلام معین الدین نعیمی لال کھوہ، موچی دروازہ کے اندر سکونت پذیر تھے۔ پاکستان وجود میں آیا تو وہ مراد آباد، انڈیا سے ہجرت کر کے لاہور آبسے۔ حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ ''دارالعلوم نعیمیہ'' کے تربیت یافتہ تھے۔ راسخ العقیدہ سنی عالم دین تھے اور ارباب قلم میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے تقریر کی بجائے تحریر کو اپنا طریق زندگی بنالیا تھا۔ ایک ماہ نامہ ''سوادِ اعظم'' جاری کیا۔ جس کے صفحات پر بعض نادر و نایاب کتابوں کے ترجمے بالاقساط شائع کرتے۔ پھر ایک وقت آتا تو ان صفحات کو جمع کر کے پوری کتاب تیار کر لیتے۔ وہ مقرر اور خطیب نہیں تھے۔ مگر ''باغ جناح'' کی جامع مسجد میں خطبۂ جمعہ دیتے۔ (اس مسجد میں ایک عرصہ سے ڈاکٹر اسرار احمد اپنے نظریات پیش کر رہے ہیں) مولانا غلام معین الدین بڑے جفاکش، محنتی اور قابل عالم دین تھے۔ انہوں نے وادی غربت میں زندگی کا سفر جاری رکھا۔ مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ عقیدے کی بات بڑی جامعیت کے ساتھ کرتے اور اس سلسلہ میں کسی مصلحت بیں عالم دین کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ انہوں نے بڑی بڑی نادر کتابوں کو اردو لباس پہنایا جو آج اہلِ علم و فضل کے مطالعہ میں آرہی ہیں۔ حضرت مولانا ابوالحسنات رحمۃ اللہ علیہ کے ہم مجلس تھے۔ ادیب بھی تھے۔ حکیم بھی تھے۔ وہ پان کو بڑے سلیقہ سے چباتے۔ میں نے کئی باران سے پان کے لیے استدعا کی

کہ وہ فرماتے جسے پان کھانے کے آداب نہیں آتے میں اسے پان نہیں دیا کرتا۔

ع پارسا آداب مے خوردن نمی داند کہ چیست؟

میں خود پان نہیں کھاتا ہوں مگر ان سے جب ملتا پان کا مطالبہ ضرور کرتا۔ مگر کمال ہے ان کی وضع داری کا، کبھی پان کے پتے کی توہین نہیں ہونے دی۔ میرے پاس آتے تو کسی دکاندار سے پان منگوا کر پیش کرتا تو ''مالِ غنیمت'' سمجھ کر کھا لیتے اور اپنے اس ادا روپیہ پر ذرا بھی شرمندگی کا اظہار نہ کرتے۔

مولانا محمد مہر الدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۸۷-۱۱-۵):

مولانا محمد مہر الدین نقشبندی جماعتی رحمۃ اللہ علیہ ایک بلند پایہ عالمِ دین، ماہر تعلیم، علوم اسلامیہ میں فاضل بزرگ تھے۔ وہ صرف و نحو، منطق، علم کلام، بیان پر نہ صرف کامل دسترس رکھتے تھے بلکہ ان کی تدریس میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انہوں نے ساری زندگی ان علوم کی تدریس میں گزار دی تھی۔ آج کے بڑے بڑے علماء کرام انہیں کے خوان کے لقمہ چیں ہیں۔ مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو جز وقتی استاد کی حیثیت سے اپنے شاگردوں کے لیے مقرر کیا تھا۔ آپ ان کے مدرسہ میں طلبہ کو فارغ اوقات میں پڑھایا کرتے تھے۔ پاکستان سے حافظ محمد عالم صاحب سیالکوٹی، صوفی غلام حسین گوجرہ والے، صاحبزادہ سید محمد اسلم صاحب علی پوری، مولانا باغ علی نسیم صاحب اور راقم الحروف آپ سے صرف، نحو اور منطق کی ابتدائی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ میری گوشمالی اور میرے رخساروں پر طمانچوں کے غیر مرئی نقوش، ابھی تک موجود ہیں۔ وہ مولانا غلام رسول صاحب موچھل امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے تربیت یافتہ تھے اور فن تدریس میں یکتائے روزگار تھے۔ دارالعلوم حزب الاحناف، دارالعلوم نعمانیہ، مدرسہ لاثانیہ، علی پور شریف جیسے مدارس میں آپ نے ایک عرصہ تک علمائے دین کو تعلیم دی۔ آپ کی بعض فنی کتابیں آج تک طلبائے علم دین کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ وہ زندگی

کے آخری ایام میں چاہ میراں میں اپنی رہائش گاہ میں رہنے لگے تھے اور دربار میر
حسین زنجانی میں جامعہ معینیہ کے بعض طلبہ کو پڑھانے میں مصروف رہے۔

پاکستان بنا، تو مسلمان مہاجرین کا ایک سیلاب پاکستان کی سرحدوں کے ا
گیا۔ لاہور خصوصاً اس سیلاب کا پہلا ٹھہراؤ تھا۔ خستہ حال مسلمان، زخمی مسلمان او
سب کچھ لٹا کر آنے والے مسلمان، قافلہ در قافلہ لاہور میں وارد ہوئے۔ ان لئے
قافلوں میں کئی علماء کرام، مشائخ، قاری، نعت خواں اور درویش آئے۔ راقم ا
طالب علم تھا مگر چند نوجوانوں کے ساتھ مل کر مہاجروں کے کسی نہ کسی کیمپ میں چلا
اور جو کچھ بن پڑتا کرتا۔ ایک دن میں نے کٹے پھٹے قافلے کو لاہور پہنچتے دیکھا، تو
اختیار رونے لگا۔ رونا کیا، آہ و فغان لے کر رویا۔ مہاجروں میں سے ایک خوبصور
چہرے والا شخص اٹھا اور مجھے سہارا دینے لگا۔ سینے سے لگا کر تسلی دی۔ اس نے
میرے اہلِ خاندان اس زخمی قافلے میں آئے ہیں۔ وہ مجھے اس خونچکاں منظر سے
کر ایک طرف لے گیا اور مجھے سہارا دے کر شہر میں میرے حجرہ تک لے آیا۔ دوسر
دن وہ پھر میرے پاس آیا۔ پھر ہر روز آنے لگا۔ وہ خوبصورت وجیہ انسان خوش لہ
بھی تھا اور شیریں کلام بھی۔ اب وہ میرے حجرے میں ہی رہنے لگا۔ ایسے کئی م
مہاجرین کے سیلاب میں بہہ کر آگئے تھے۔ ایک دن سحری کے وقت اسے میں
قرآن پڑھتے سنا تو دل گرفتہ ہوگیا۔ اللہ اللہ! سوز قرات اور انداز تلاوت کے نقو
آج تک میرے دل و دماغ میں مرتسم ہیں۔

تو میدانی کہ سوز قرات تو   دگرگوں کرد تقدیر ''عمر'' را

''تقدیر عمر'' تو صدیوں پہلے بدل چکی تھی۔ اور پھر عمر نے دنیا بھر کی تقدیر کو بدل
رکھ دیا تھا۔ لیکن آج ایک قاری کی قرات نے عمر کے بیٹے کی تقدیر بدل دی۔ میں
التجا کی۔ آپ مجھے قرآن پڑھنا سکھا دیں۔ اس نے ہامی بھرلی۔ پندرہ دن مجھے مشق کر

رہا۔ اس نے بتایا کہ وہ ''پانی پت'' سے اپنے بچوں کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ مگر آگے وہ
میرے سامنے کچھ نہ کہتا۔ اس کی تربیت سے میں قرآن کے الفاظ پڑھتا تو دل سے جھوم
جاتا۔ پندرہ دن کے بعد وہ غائب ہوگیا اور آج تک بس اس قاری کی یاد اور شکل و صورت تو
سامنے آتی ہے مگر خدا معلوم وہ کہاں گیا، کہاں بسا، کن کن لوگوں کو قرآن سناتا گیا۔
آج جب علماء کی مجالس کی باتیں لکھتا ہوں تو اس گمنام قاری کی یاد تڑپا جاتی ہے۔

(''جہانِ رضا'' مئی ۱۹۹۴ء)

یادوں کے چراغ

علامہ غلام قادر اشرفی رحمۃ اللہ علیہ (م:۲۶-۸-۷۹):

مولانا غلام قادر اشرفی آف ''لالہ موسیٰ'' سے پہلی ملاقات ''ہارون آباد'' بہاول پور کے ایک جلسہ کے بعد ہوئی۔۱۹۴۴ء میں حضرت مولانا اشرفی علماء کرام کی ایک ٹیم کے ساتھ مولانا احمد دین درگاہی مرحوم، خطیب جامع مسجد ہارون آباد کی دعوت پر ایک جلسہ میں تقریر کرنے گئے تھے۔آپ کا لباس گیروا کھدر کا تھا اور سر پر سکھوں کی طرح رنگدار پگڑی سجائے ہوئے تھے۔علمائے کرام کے اجتماع میں ایک ''سکھ نما مولوی'' ہمیں عجیب سا لگا۔ جب تقریر کرنے اٹھے تو سکھوں کی زباں گورمکھی میں قرآن و احادیث بیان کرنے لگے۔ یہ بات ہم جیسے نووارد طالب علموں کے لیے حیران کن تھی۔ملاقات ہوئی تو مولانا کی زبان میں مٹھاس تھی، شیرینی تھی اور اپنائیت تھی۔وہ ہر ایک سے خوشگوار بات کرتے۔لباس و گفتار کے متعلق انہوں نے بتایا کہ وہ ریاست ''فرید کوٹ'' میں پیدا ہوئے۔سکھوں کے سکولوں میں پڑھے، وہی لباس اور انداز گفتگو اپنایا۔کالج چھوڑ کر دینی تعلیم کیلئے ''جامعہ نعیمیہ'' مراد آباد (یو-پی) پہنچے۔فارغ التحصیل ہو کر ''مولوی'' کی بجائے ''گیانی'' بن کر ہندی، سنسکرت اور گورمکھی میں قرآن و احادیث کا مطلب بیان کرنے لگے۔انہوں نے بتایا کہ نواب شاہ نواز آف ممدوٹ نے انہیں سیاسی میدان میں لا کھڑا کیا۔ جہاں وہ ''شدھی تحریک'' کے خلاف سکھوں کے بھیس میں اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ مسلم لیگ میں شامل ہو کر کانگریس اور احراری مولویوں اور نیشنلسٹ علماء کو للکارتے رہے۔سائمن کمیشن کا بائیکاٹ، مغلپورہ ایجی ٹیشن، تحریک کشمیر، قادیانی تحریک، مسجد شہید گنج کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔

پاکستان بنا تو مولانا اشرفی لالہ موسیٰ سے لاہور آتے تو ہم ان کی تقریر سننے جاتے اور ملاقات بھی کرتے۔اس طرح ان سے رفاقت بڑھتی گئی۔وہ خوش گفتار مجلسی آدمی تھے اور خوش گفتاری سے لوگوں کو قریب کر لیتے۔وہ علمائے اہل سنت کے ہر تنظیمی اجلاس میں شرکت کرتے۔علمائے اہل سنت سے اعتقادی وابستگی کے ساتھ ساتھ انہیں مسلم لیگ کا سیاسی پلیٹ فارم پسند تھا۔لاہور آتے تو سردار شوکت حیات، ملک فیروز خان نون، ممتاز دولتانہ اور دوسرے مسلم لیگی لیڈروں کے ساتھ وقت گزارتے۔پاکستان بننے کے بعد وہ ان علماء کرام کی ٹیم کے ساتھ وابستہ ہو گئے جو ملک میں نفاذ اسلام کی جدوجہد میں مصروف تھی۔آپ نے ''تحریک ختم نبوت'' میں بھرپور حصہ لیا۔ جمعیت علماء پاکستان کی تشکیل نو میں بھرپور کردار ادا کیا۔ پھر ۱۹۷۴ء کی ''تحریک ختم نبوت'' میں زبردست کام کیا۔''تحریک نفاذ نظام مصطفیٰ'' چلی تو جمعیت علماء پاکستان کا علم اٹھا کر آگے بڑھے اور قید و بند میں رہے۔

مولانا علامہ غلام قادر اشرفی، حضرت محدث کچھوچھوی سے بیعت ہوئے تو ''اشرفی'' کہلائے۔حج بیت اللہ کرنے گئے تو مدینہ منورہ میں حضرت قطب مدینہ، مولانا ضیاء الدین قادری مدنی خلیفہ مجاز اعلیٰ حضرت الشاہ احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجلس نشین بن گئے۔پھر ان کے صاحبزادے الشیخ فضل الرحمان مدنی کے رفیق کار رہے۔ ان نسبتوں سے آپ کے مزاج میں درویشی آ گئی عالمانہ جاہ و جلال اور مناظرانہ جنگ و جدال چھوڑ کر فقیرانہ لباس میں آ گئے۔خاک نشینوں اور انکسار پسندوں میں بیٹھ کر خوشی محسوس کرتے۔ہم جیسے راہ نشین ملتے تو ان کا چہرہ کھل اٹھتا۔مولانا ضیاء الدین مدنی کی مجلس سے اٹھ کر پاکستان آتے تو ''مرکزی مجلس رضا'' کے بانی حکیم محمد موسیٰ امرتسری کی مجالس میں صبح و شام گزارتے اور حکیم صاحب کے کام میں برابر کے شریک رہتے۔

آپ اس درویشانہ زندگی میں کئی بار حج اور دیار حبیب کی حاضری کے لیے مدینہ منورہ گئے۔اب ان کے احباب کا حلقہ علماء کرام کی بجائے فقیروں، درویشوں،

خاکساروں اور بوریا نشینوں کا ہو گیا تھا۔ میں اگرچہ کتابی دنیا کا ''درویش بے گلیم'' تھا مگر مجھ پر ان کی عنایات زندگی کے آخری لمحہ تک برستی رہیں اور وہ ''حدیث دل'' بتانے سے گریز نہ کرتے۔ انہیں آج اہل علم وفضل اور اہل ذکر وفکر دونوں طبقے یاد رکھتے ہیں۔ آج وہ لالہ موسیٰ شہر کے مغرب کی طرف آرام فرما ہیں۔

توان شناخت کہ زیں خاک مردی خیزد!

مولانا مفتی محمد عبدالعزیز مزنگوی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۶۳-۱۲-۱۶):

مولانا محمد عبدالعزیز چشتی مزنگوی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت اس وقت ہوتی، جن دنوں وہ میرے استاد حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حاضر ہوتے اور اعتقادی اور نظریاتی مسائل پر گفتگو کرتے۔ وہ صاحب علم وقلم بزرگ تھے۔ عقیدہ درست اور مضبوط۔ صبح وشام تحریر وتقریر میں مصروف رہتے۔ وہ عالمانہ لباس زیب تن کرتے۔ سفید براق لباس، پھر سر پر سفید، شملہ دار عمامہ۔ ان دنوں علمائے کرام اپنے عالمانہ لباس میں بود وباش کیا کرتے تھے۔ ہزاروں کے ہجوم میں لباس سے ہی دکھائی دیتا کہ یہ شخص عالم دین ہے۔ میں نے پاکستان بننے تک کسی عالم دین کو نہیں دیکھا کہ وہ ننگے سر باہر نکل آیا ہو یا عامیانہ لباس میں گھر سے نکلا ہو۔ وہابی علماء کبھی کبھی ننگے سر باہر نکل آتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ آدھی نماز چھوڑ کر مسجد سے بھاگ آئے ہوں۔ پاکستان کے بعد تو ہمارے اکثر علماء بھی ننگے سر چھلانگیں لگاتے نظر آتے ہیں مگر مولانا عبدالعزیز مزنگوی کا زمانہ اہل علم کے آداب لباس کا زمانہ تھا۔ مولانا عالمانہ لباس میں آتے اور وضع قطع میں عالم دین ہی دکھائی دیتے۔ مجھے یاد ہے کہ آپ کے عمامہ کے نیچے کان کی لو میں ہمیشہ قلم ہوتا۔ آپ تقریر وخطاب کی نسبت تحریر وتصنیف میں زیادہ وقت دیتے۔ میں نے اکثر انہیں ''ملک دین محمد اینڈ سنز'' ناشر کتب کشمیری بازار کی دکان میں دیکھا۔ وہ کتابوں کی تصحیح کا کام کرتے۔ مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کا ترجمہ قرآن نیا نیا چھپا تھا جو بڑا مشہور ہوا۔ دیو بندیوں کے ترجموں میں دوسری اغلاط

علاوہ اللہ اور اس کے محبوب کے متعلق عامیانہ الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔ ''اللہ صاحب نے یوں کہا''، ''محمد صاحب نے یوں بتایا'' یہ انداز بیاں اس وقت کے دیو بندیوں میں عام تھا۔

مولانا عبدالعزیز مزنگوی نے مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کے ترجمہ قرآن ''عزیز البیان فی تفسیر القرآن'' کے حواشی لکھ کر ان عقائد کی تردید کر دی جو دیو بندیوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ مولانا کی اس کوشش پر دیو بندی مکتب فکر نے بڑا شور مچایا مگر مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کے ترجمہ پر مولانا عبدالعزیز کی تفسیر بڑی مقبول ہوئی۔ مولانا نے اور بھی بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان کی ایک کتاب ''احسن الاقوال فی احوال الاقوال'' ہے جسے راقم نے اپنے مبسوط مقدمہ کے ساتھ ''مکتبہ نبویہ'' سے چھپوا کر رجال الغیب کے حالات کی وضاحت کی تھی۔

مولانا عبدالعزیز مزنگوی مرحوم ''مزنگ'' میں جنازہ گاہ کی مسجد کے اعزازی خطیب رہے۔ پھر ایک عرصہ تک قلعہ مادھو سنگھ ''مزنگ'' میں مسند درس پر فائز رہے۔ ہم طالب علمی کے زمانہ میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے تو دینی مسائل سے مالا مال ہو کر آتے۔

پاکستان بنا تو آپ کا حلقہ احباب وسیع ہو گیا۔ عقائد اہل سنت پر ان کی کتابیں بازار میں آنے لگیں۔ کتابوں کے مطالعہ میں کوئی مشکل پیش آتی تو ہم لوگ مزنگ جاتے۔ وہ نہایت خندہ پیشانی سے ان اشکال کا حل فرماتے۔

صوفی غلام حسین گوجروی رحمۃ اللہ علیہ:

۱۹۳۹ء میں مولانا نبی بخش حلوائی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کا دار العلوم دین اور معارف تصوف کا مرکز تھا۔ دور ونزدیک سے طلبہ آتے، دینی نصاب کی کتابیں پڑھتے۔ ارباب تصوف آتے تو نقشبندی سلوک کی تربیت پاتے۔ انہی دنوں صاحبزادہ سید علی حسین شاہ علی پوری جو اسی دار العلوم سے فارغ التحصیل ہو کر گئے تھے۔ اپنے چند

مریدوں کے ساتھ اپنے استاد گرامی مولانا نبی بخش حلوائی کی خدمت میں آئے۔ ا
کے ساتھ ایک نوخیز نوجوان تھا جو بڑا ہو کر خطیب پاکستان صوفی غلام حسین گوجر
کے نام سے شہرت یاب ہوا۔ صاحبزادہ سید علی حسین صاحب کی خواہش تھی کہ ا
حضرت علامہ حلوائی کی تربیت ملے۔ صاحبزادہ صاحب نے سفارش کی کہ یہ نوجو
نعت خوان رسول ہے، اسے قبول فرمالیں۔ ہم نے زندگی میں پہلی بار تعجب سے دیک
کہ ایک نعت خوان موذن کی طرح کانوں پر انگلی رکھ کر نعت پڑھ رہا ہے۔ نعت سنا
داخلہ مل گیا۔

صوفی غلام حسین رمداس ضلع گورداسپور (انڈیا) کے رہنے والے تھے۔ والد صا
محمد دین حضرت ثانی صاحب علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے اور شریک سفر بھی۔ ا
نوجوان طالب علم نے محنت وریاضت سے کتابوں کو کھانا شروع کر دیا۔ کچھ وقت ہ
میرے ہم سبق رہے۔ صوفی غلام حسین، حافظ محمد عالم، صاحبزادہ سید محمد اسلم علی پو
اور راقم ''علم الصیغہ'' اور صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں مولانا مہر الدین صاحب جما
سے اسی مدرسہ میں پڑھتے رہے۔ صوفی غلام حسین مرحوم اپنی تیز رفتاری سے ہمیں
پیچھے چھوڑ گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کتابوں کے علاوہ صوفی غلام حسین گوجروی
''گلستان سعدی'' کا دیباچہ زبانی یاد کر لیا تھا۔ ''زلیخا جامی'' کے اکثر اشعار ان کی نو
زبان پر تھے۔ مثنوی مولانا روم کے اکثر اشعار ازبر تھے۔ نعت خوان تھے، خوش آو
تھے۔ بڑے ہو کر خطابت کی دنیا میں ابھرے تو میں نے دیکھا کہ وہ ''گلستان''
بوستان'' اور ''جامی'' کے اشعار وواقعات سے اپنی تقریر کو اتنا مزین کرتے کہ سامعی
عش عش کر اٹھتے۔ پاکستان بنا تو صوفی غلام حسین مرحوم اپنے والدین کے سا
''گوجرہ'' میں آبسے اور ''صوفی غلام حسین گوجروی'' کے نام سے شہرت یافتہ ہو
انہوں نے ساری زندگی وعظ کی مجالس کو رونق بخشی اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے بیا
خطاب سے اہل ذوق کے دل ودماغ کو اسلام کی عظمتوں کے سامان سے مالا مال

ا۔ وہ جہاں جاتے لوگ ان کی تقریر کو سننے کے لیے جوق درجوق آتے۔ وہ بولتے تو
ٹوں گھنٹے بولتے جاتے اور لوگ سنتے سنتے نہ تھکتے۔

ع وہ قصہ فراق سناتے چلے گئے!

ایک خطیب اور مقرر کی حیثیت سے صوفی غلام حسین گوجروی مرحوم نے بڑی
رپور زندگی گزاری۔ سنی واعظوں اور خطیبوں میں نام پیدا کیا۔ جلسوں کی زینت بنے
ہے اور سامعین کے محبوب خطیب بن کر زندہ رہے۔

مولوی خیر الدین فلسفی ''سائیں بابا'':

تعلیم کے دوران جب مجھے ابتدائی کتابوں سے گزر کر آگے بڑھنا پڑا تو
''صدرا'' کے موضوعات پڑھنے کے باوجود میرے پلے کچھ نہ پڑا۔ مجھے ایک عالم
دین نے بتایا کہ مصری شاہ کی ایک کٹڑی میں ایک فلسفی مولوی خیر الدین رہتا ہے۔ وہ
تارک الدنیا ہے۔ علی الصبح شہر چھوڑ کر لاہور کے شمال کی طرف نکل جاتا ہے۔ باغوں
سے گزرتا ہوا، دریائے ''راوی'' کے کنارے پر پھیلے ہوئے ذخیرہ جنگلات میں سارا
دن گزار دیتا ہے۔ خاموش طبع ہے، کسی سے بات نہیں کرتا۔ کسی طالب علم کو نزدیک
نہیں آنے دیتا۔ مگر علم کا دریا ہے، فلسفے کا بادشاہ ہے، منطق کا امام ہے اور علوم عقلیہ کا
سمندر ہے۔

مجھے مولوی خیر الدین سے ''صدرا'' پڑھنے کا شوق دامن گیر ہوا۔ اس کی رہائش
پر جا پہنچا۔ وہ گھوڑوں کے ایک اصطبل کے پیچھے ایک تنگ وتاریک کوٹھڑی میں رہتا
تھا۔ اصطبل کا مالک بھنگ کا رسیا تھا اور مولوی خیر الدین کو اپنا پیرومرشد بنا کر ''سائیں
بابا'' کہتا تھا۔ میں نے اپنے علمی شوق کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگا ہم نے ''سائیں بابا''
سے نہ کبھی علم کی بات سنی، نہ پوچھی۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں ساری رات نمازیں پڑھتا رہتا
ہے۔ جب میرا کوئی گھوڑا بیمار ہوتا ہے یا پولیس میرا چالان کرتی ہے تو سائیں بابا ''اللہ
خیر کرے گا'' کہہ کر ''راوی'' کے کنارے چلا جاتا ہے۔ گھوڑا تندرست، چالان

معاف۔ بس اس سے زیادہ اسے کچھ نہیں آتا۔ تم مسجدوں میں کتابیں پڑھا کرو۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔

اس کے باوجود میں نے مولوی خیر الدین کا تعاقب جاری رکھا۔ کئی دنوں کی کاوش کے بعد ایک دن علی الصبح ان کے پیچھے ہولیا۔ ان دنوں ''سفید مسجد'' مصری شاہ سے آگے دور دور تک گھنے باغات پھیلے ہوتے تھے۔ پھر جنگلات کا سلسلہ راوی کے کنارے تک چلا جاتا۔ ان دنوں لاہور کا حفاظتی بند نہیں بنا تھا۔ کئی دنوں کے مسلسل تعاقب کے بعد مولوی خیر الدین نے میری بات سنی اور ''صاحب صدرا'' اور اس کے معاصرین پر اتنے شاندار الفاظ میں خیالات کا اظہار کیا کہ میں دنگ رہ گیا۔

دل ہی دل میں کہتا کہ علم کو گھوڑوں کے طویلے میں ذلیل کرنے والا مولوی خیر الدین اس جنگل میں سارا دن گزار دیتا ہے۔ مسجد اور مدرسہ سے کیوں دور رہتا ہے۔ راوی کے ذخیرہ میں برگد کا ایک قد آور درخت تھا۔ اس کی ٹہنیوں پر ''شپرہ چشم'' (کھنک) الٹے لٹکے رہتے تھے۔ ایک دن مولوی خیر الدین نے دو شپرہ چشم قابو کر لیے اور مجھے پاس بلا کر ایک کا منہ کھولا اور کہا یہ لو سرخ شنگرف کی ڈلی اور اس کے منہ میں ڈالو، میں نے ڈلی ڈال دی۔ دوسرا شپرہ چشم پکڑا اور مجھے فرمایا اس کے منہ میں یہ ''پارہ'' ڈال دو۔ اب دونوں پرندوں کے پر باندھ کر برگد کی ٹہنیوں سے باندھ کر لٹکا دیا۔ چالیس دن گزر گئے۔ کبھی کبھی درخت پر چڑھ کر مولوی خیر الدین انہیں کچھ کھلاتا۔ چالیس دن گزرنے کے بعد انہیں ذبح کر کے شنگرف اور پارہ نکال لیا۔ اس دن وہ اتنا خوش تھا جیسے اس نے لاہور فتح کر لیا ہو۔ مجھے کبھی کبھی چند سطریں زبانی پڑھا دیتے اور فلسفیوں اور منطقیوں کے واقعات سنا دیتے۔ دوسرے دن میں نے دیکھا وہ ایک پاؤ خالص تانبہ لیے جنگل میں لکڑیوں کا ڈھیر لگائے آگ بھڑکا رہا ہے۔ مٹی کا ایک پیالہ جس میں تانبہ، شنگرف اور پارہ رکھ دیا گیا۔ آگ کے شعلے بھڑکتے رہے۔ میں دیکھتا رہا۔ مولوی خیر الدین کی نظریں اس پیالے پر گڑی ہوئی تھیں۔ آگ

[illegible] میں نے دیکھا پارہ دھواں بن کر اڑ رہا ہے۔ شنگرف پگھل کر تانبے پر پھیل رہی اور تانبے کا ٹکڑا سرخ ہو گیا ہے۔ آگ بجھی تو تانبہ اور شنگرف پیالے میں اور پارہ [illegible] میں۔ ادھر مولوی صاحب کا چہرہ فق!

کسی کے ''اڑنے'' سے ساقی کے ایسے ہوش اڑے
شراب سیخ پہ ڈالی کباب پیالے میں

اس وقت مولوی خیر الدین کی حالت دیدنی تھی اور اس کی مایوسی اور پریشانی دیکھ کر دکھ ہوتا تھا۔ ٹھنڈی آہ بھر کر کہنے لگا یا تو شپرہ چشم بیمار تھا یا آگ کی تپش کم تھی ورنہ [illegible] تانبہ، تانبہ نہ ہوتا، سونا ہوتا!

میں دوسرے دن گھوڑوں کے طویلے میں گیا تو مجھے بتایا گیا رات ''سائیں بابا'' نہیں آئے۔ دوسرے دن گیا، تیسرے دن گیا، چوتھے دن گیا، ''سائیں بابا'' نہ آئے۔ آخر پانچویں دن میں آگ کے اس الاؤ کے پاس پہنچا جہاں مولوی خیر الدین شنگرف اور پارے کو اپنے آتش کدہ میں اڑا چکے تھے۔ نہ مولوی خیر الدین نظر آئے نہ ''سائیں بابا'' دکھائی دیے۔ میں نے دیکھا ''فلسفے'' اور کیمیا گری'' کا بادشاہ ''پارے'' اور ''شنگرف'' کی گرمی میں گم ہو گیا ہے۔

حافظ محمد نواز نقشبندی:

حافظ محمد نواز نقشبندی، میانوالی سے اٹھے اور لاہور کے ایک شمالی محلے ''حبیب گنج'' میں سکونت پذیر ہوئے۔ مسجد چھوٹی تھی، محلے کے لوگ غریب تھے مگر حافظ محمد نواز زانوئے تہ کر کے اللہ کے گھر میں بیٹھ گئے۔ تنخواہ اور فیس کے بغیر محلے کے بچے حفظ و ناظرہ کی منزلیں طے کرنے لگے اور حافظ صاحب فقر و فاقہ کو اپنائے زندگی کی راہ پر گامزن رہے۔ وہ مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقش بندی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد کوتوالی میں حاضری دیتے۔ نقشبندی سلوک کی منزلیں طے کرتے حضرت ثانی صاحب علی پوری رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور مولانا حلوائی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ثانی صاحب کے خلیفہ مجاز۔

حافظ محمد نواز قرآن پڑھتے تو لطف آ جاتا۔ تراویح سناتے تو دریا بہتا سنائی دیتا۔ بڑے خوش گفتار اور خوش رفتار تھے۔ قوت لایموت سے جو کچھ بچتا، غربا اور درویشوں میں تقسیم کردیتے۔

کتاب دوست تھے، کتاب والوں سے محبت کرتے۔ دل پسند اور نایاب کتاب جہاں سے ملتی، خرید لیتے۔ ایک کتاب فروش کے پاس پرانی کتاب دیکھی، دل کو بھا گئی، پشمینے کی چادر دکاندار کے حوالے کی، ٹھٹھرتے ہوئے کتاب لے آئے۔ کئی دن بعد پیسے ملے تو گروی چادر واپس لے آئے۔ آج کا مولوی کتاب کو کب خریدتا ہے۔ وہ ''بارہ تقریریں'' پڑھ کر قوم کو خطاب کرتا ہے اور ''وعظ فروشی'' کا بیوپاری بن گیا ہے۔

حافظ محمد نواز تصوف کی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگے۔ ذکر و فکر کی محافل میں وقت گزارنے لگے۔ خوش خط تھے۔ کتابی ذوق کا چسکا ایسا تھا کہ اگر کسی کے پاس نادر و نایاب کتاب دیکھتے تو اسے اپنے قلم سے نقل کر کے جلد کروا لیتے۔ خواہ نقل کرتے کئی ماہ لگ جاتے۔ زندگی گزارتے گئے، مسجد بنواتے گئے، شاگرد بڑھاتے گئے، مقامات سلوک طے کرتے گئے۔ جس دن اس دنیا سے رخصت ہوئے تو جنازے کے ساتھ ہزاروں عقیدت مند تھے۔ جنازگاہ میں جگہ کم تھی تو ''انجینئرنگ یونیورسٹی'' کی گراؤنڈ میں جنازہ ہوا۔ دفناتے وقت چالیس حافظان قرآن قبر کے اردگرد تلاوت قرآن کر رہے تھے۔ قبر میں اتارے گئے تو چہرہ نور کی لپٹیں لیے ہوا تھا۔

نگاہ میں برق نہ تھی، شکل آفتاب نہ تھی
یہ بات کیا ہے انہیں دیکھنے کی تاب نہ تھی

(''جہانِ رضا''، جون ۱۹۹۴ء)

گنج ہائے گراں مایہ

مفتی اعجاز ولی خاں رضوی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۲۰-۱۱-۷۳):

مفتی اعجاز ولی خاں رضوی (قدس سرہ) سے اس وقت نیاز مندی حاصل ہوئی جب آپ ''دار العلوم نعمانیہ لاہور'' کے شیخ الحدیث، ''جامع مسجد اسلام پورہ'' کے خطیب، ''جامعہ گنج بخش'' کے ناظم اعلیٰ اور ماہنامہ ''گنج بخش'' کے مدیر شہیر تھے۔ آپ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے خانوادہ سے تھے۔ ''اعلیٰ حضرت'' سے قرآن پاک کی تعلیم کا آغاز کیا اور بچپن میں آپ سے ہی بیعت کی سعادت حاصل کی۔ آپ نے اپنے اسی خانوادہ کے بلند پایہ علماء کرام سے علوم مروجہ کی تکمیل کی۔ اپنے برادر گرامی حضرت مولانا تقدس علی خاں شیخ الحدیث ''جامعہ راشدیہ'' پیر جو گوٹھ (سندھ) مولانا سردار احمد سلطان پوری، مولانا حسنین رضا بریلوی، مفتی اعظم ہند مصطفیٰ رضا بریلوی، حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں بریلوی، صدر الشریعۃ مولانا امجد علی اعظمی (رحمہم اللہ) جیسے بلند پایہ علماء کے سامنے زانوئے ادب تہ کیے اور علوم اسلامیہ پر عبور حاصل کیا۔

مفتی اعجاز ولی خاں مرحوم ایک مقتدر عالم دین ہونے کے باوجود بڑے ملنسار، انکسار اور دوست نواز بزرگ تھے۔ وہ نہ کسی پر تنقید فرماتے اور نہ کسی کی حرف گیری کرتے۔ عقیدہ کے پکے، دل کے سچے اور لوگوں سے پیار و محبت کے خوگر تھے۔ میں نے حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی کتاب ''تکمیل الایمان'' کا اردو ترجمہ کیا تو کتاب چھپتے ہی سب سے پہلے آگے بڑھے اور بیس کتابیں خرید کر لوگوں میں تقسیم کرتے گئے۔ جب مجھے ''مرج البحرین'' کے ترجمہ کی سعادت حاصل ہوئی تو ابھی کتاب کی جلد کی تزئین نہیں ہوئی تھی کہ بیس نسخے خرید کر لے گئے اور اسی رات ماڈل ٹاؤن میں

حضرت محدث دہلوی کے سالانہ عرس کی تقریب میں لے جا کر علماء میں تقسیم کرنے لگے۔ یہ بات ان کی علم دوستی اور حضرت شیخ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی کمالات کا اعتراف تھا۔

مفتی اعجاز ولی خاں مرحوم اپنی تدریسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ''جمعیت علماء پاکستان'' کے ساتھ سیاسی وابستگی رکھتے تھے۔ آپ جمعیت کے مختلف عہدوں پر منتخب ہوئے اور زندگی بھر اس دینی وسیاسی جمعیت میں کام کرتے رہے۔ انہیں اس سیاسی وابستگی کی وجہ سے کئی بار اپنی ملازمت، امامت اور تدریسی فرائض سے محروم ہونا پڑا مگر وہ مستقل مزاجی سے اپنی راہ پر گامزن رہے۔ آج اپنے بعض علماء کرام کو مساجد اور مدارس کی جاہل انتظامیہ کے سامنے سرنگوں ہو کر اپنی سیاسی اور دینی جماعت ''جمعیت علماء پاکستان'' کی صفوں سے بھاگتے دیکھتا ہوں تو مجھے مفتی اعجاز ولی خاں کا کردار دوپہر کے سورج کی طرح درخشاں نظر آتا ہے۔ مفتی اعجاز ولی خاں بڑے خلیق انسان تھے۔ میں ان کی انکساری اور حسن اخلاق سے اتنا متاثر تھا کہ ایک دن میں نے ازراہ تفنن کہہ دیا: ''مفتی صاحب! مجھے ڈر ہے کہ آپ کو راستہ میں ابلیس کھڑا کر کے سلام کرے تو آپ اسے بھی ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ'' کہہ دیں گے''۔ فرمانے لگے ''نہیں اتنا بھی خلیق نہیں ہوں، لاحول ولاقوۃ الا باللہ کا کوڑا مار کر اسے بھگا دوں گا''۔

مفتی اعجاز ولی خاں ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران میرے ساتھ اگلے مورچوں پر گئے۔ دوسرے لفظوں میں میں ان کے ساتھ اگلے مورچوں پر گیا۔ ہمارے ساتھ بڑے نامور علماء اہل سنت کا ایک وفد تھا۔ اگرچہ ہر عالم دین نے اپنے اپنے انداز میں غازیان صف شکن کے سامنے اسلامی جہاد کی فضیلت پر گفتگو کی مگر مفتی اعجاز ولی خاں مرحوم کا انداز روحانی تھا، جسے موت وحیات کے درمیان کھڑے جوانوں نے بے حد پسند کیا۔ آپ نے بعض نوجوانوں کو ایسے وظائف بھی بتائے، جسے سپاہی سے لے کر کمانڈر تک، ہر ایک نے حاصل کرنے میں دلچسپی لی۔ مفتی صاحب قبلہ علمی مصروفیت

کے ساتھ ساتھ خانقاہ بریلی کے ان تعویذات اور وظائف کے مجاز تھے، جو ''شمع شبستان رضا'' میں درج ہیں۔ ان کی وفات کے بعد ''دارالعلوم نعمانیہ لاہور'' میں آج تک ان حضرات کے خطوط آتے ہیں، جو ان سے اپنے مصائب کا روحانی علاج تلاش کرتے تھے۔

مفتی صاحب مرحوم علماء اہلسنت کی محبوب ومرغوب شخصیت تھے۔ تمام علماء کرام ان سے محبت کرتے تھے۔ ان علماء کرام کی علمی مجالس کے علاوہ انہیں حضرت علامہ سید ابوالبرکات صدر نشین ''انجمن حزب الاحناف لاہور'' سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ اپنا زیادہ وقت حضرت کی خدمت میں گزارتے۔ علامہ ابوالبرکات ایک فاضل اجل، بلند پایہ ماہر علوم وفنون درسیہ اور راسخ العقیدہ سنی عالم دین تھے۔ وہ اپنی علمی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ ''سلسلہ قادریہ'' کی روحانی مسند پر بھی فائز تھے۔ ان دونوں نعمتوں سے حضرت مفتی اعجاز ولی خاں نے وافر حصہ پایا تھا۔

حضرت مولانا فضل عثمان فاروقی مجددی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۵-۴-۷۳):

حضرت مولانا فضل عثمان مجددی فاروقی رحمۃ اللہ علیہ افغانستان کے روحانی خانوادہ مجددیہ کے نامور فرزند تھے۔ آپ کے والد مُلّا شور بازار افغانستان کے سیاسی اور روحانی راہنماؤں میں صف اول کے راہنما تھے۔ انگریزوں کے خلاف جنگ مزاحمت میں حضرت ''ملا شور بازار'' نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ آپ نے ''بچہ سقہ'' کی شورش کے دوران افغانستان کی سالمیت کی خاطر اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس جرم پر کابل کے گورنر خان عطا محمد نے آپ کو موت کی سزا سنائی مگر تختہ دار تک پہنچنے سے پہلے ہی جنرل غلام نبی خاں نے افغانستان کا بہت بڑا علاقہ واگزار کرا لیا۔ اس یلغار کی وجہ سے آپ موت کے دروازے پر دستک دے کر واپس آ گئے۔ ''تحریک پاکستان'' کے دوران حضرت پیر فضل عثمان مجددی نے افغانستان کے ہندو نواز حکمرانوں کے رویے کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔

پاکستان کی دعوت پر کشمیر کی پہلی یلغار میں آپ نے اپنے ایک لاکھ مرید مختلف قبائل سے جمع کر کے حکومت پاکستان کے حوالے کیے۔ پھر آپ پاکستان آئے اور برصغیر میں پھیلے ہوئے اپنے لاکھوں مریدوں کو پاکستان کی حمایت اور کشمیر کے جہاد کے لیے تیار کیا۔ آپ اس مقصد کے لیے ہندوستان میں دہلی، کاٹھیاواڑ، بمبئی، کلکتہ اور مشرقی پاکستان کے دور دراز علاقوں تک پہنچے۔ آپ کا یہ انداز نہ حکومت ہندوستان کو پسند تھا، نہ افغانستان کے حکمرانوں کو، چنانچہ آپ کے لیے ہندوستان اور افغانستان میں داخل ہونے پر پابندی لگا دی گئی۔

پاکستان میں صدر ایوب نے آپ کی سیاسی خدمات کی بڑی قدر کی۔ آپ کو شاہی مراعات کا پراٹوکول دیا گیا۔ آپ کچھ عرصہ کراچی میں رہے، پھر لاہور آ گئے۔ لاہور کے قیام کے دوران آپ کی رہائش گاہ ''گلبرگ'' میں تھی۔ یہاں علماء و مشائخ کا جمگھٹا لگا رہتا۔ مجھے بھی صدر المشائخ مولانا فضل عثمان فاروقی سے انہی مجالس میں نیاز مندی کا موقع ملا۔ لاہور میں میرے اہتمام میں ''یوم فاروق اعظم'' منایا گیا تو آپ مولانا ابوالحسنات رحمۃ اللہ علیہ کی وساطت سے صدر جلسہ تھے۔ مولانا محمد بخش مسلم، صاحبزادہ فیض الحسن آلومہاروی، مولانا غلام محمد ترنم اور مولانا محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہم نے سیدنا عمر فاروق کی زندگی پر بڑی پرزور تقاریر کیں۔ میری گزارش پر ''صدر المشائخ'' نے فارسی میں تقریر کی۔ مجھے یاد ہے کہ آپ کے پرجوش بیان اور ایمان افروز تقریر نے سامعین کو مسحور کر دیا اور کئی سال تک ان کی تقریر کا تذکرہ رہا۔ وہ مجاہدانہ کردار کے مالک تھے۔ وہ ''سلسلہ مجددیہ'' کا علمی و روحانی مرکز تھے اور پاکستان کو ''نظام مصطفیٰ'' کی رونقوں سے شاداب دیکھنے کے خواہاں تھے۔ وہ فلسطین کی جنگ کے راہنما مفتی اعظم سید امین الحسینی کے دوست تھے۔ غازی کشمیر مولانا ابوالحسنات کے دست راست تھے۔ عالم اسلام میں جنگ آزادی لڑنے والے مجاہدین راہنماؤں سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ ۱۹۷۳ء میں فوت ہوئے تو ان کے جسد خاکی کو ایک خصوصی طیارے سے کابل

لے جایا گیا، جہاں ''خانقاہ عالیہ مجددیہ قلعہ جواد کابل'' میں اپنے والد فضل عمر ملا شور بازار کے پہلو میں آسودہ خاک ہیں۔

سید محمد معصوم شاہ گیلانی: (م: ۱۹۶۹-۱-۱۸)

ہم قیام پاکستان سے پہلے حضرت سید ابوالحسن ہجویری داتا گنج بخش لاہور رحمۃ اللہ علیہ کی آستاں بوسی کے لیے حاضر ہوتے تو داتا صاحب کے بازار میں کتابوں کی ایک دکان پر ضرور رکتے۔ اس دکان کی پیشانی پر ''نوری کتب خانہ'' کا بورڈ لگا ہوتا اور دکان کی مسند پر ایک درویش صفت بزرگ بیٹھے نظر آتے۔ دکان پر چھوٹے چھوٹے رسالے رکھے ہوتے جن کے عربی نام ہماری سمجھ میں نہ آتے۔ علماء کرام سے سنا کہ یہ بزرگ حضرت مولانا سید محمد معصوم شاہ گیلانی نوری ہیں۔ بڑے عالم ہیں، صوفی ہیں اور پیر طریقت ہیں۔ ہم نے سید معصوم شاہ کو نہ عالمانہ شان میں کبھی دیکھا نہ وعظ و تقریر کے سٹیج پر دیکھا، نہ جبہ و دستار سجائے پیر طریقت بنے دیکھا مگر ان کی دکان کے سامنے سے جو سنی عالم گزرتا، انہیں ادبا سلام کرتا۔ چند لمحے بیٹھتا اور اگر دل میں آتا تو چند رسالے بھی لے لیتا۔

سید محمد معصوم شاہ گیلانی رحمۃ اللہ علیہ سادہ چک گجرات سے آئے اور حضرت داتا گنج بخش لاہور کے مزار کے زیر سایہ دینی کتابوں خصوصاً اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کی اشاعت کرنے لگے۔ ان دنوں عام لوگ اعلیٰ حضرت کی علمی اور اعتقادی خدمات سے نا آشنا تھے۔ سید معصوم شاہ گیلانی نوری وعظ و بیان کی مجالس کے عالم دین نہ تھے، نہ طریقت کا حلقہ بنا کر مریدوں کو گھیرے میں لے کر بیٹھنے کے عادی تھے مگر وہ سنی اعتقادی کتابوں کی اشاعت کے منفرد اور ممتاز ناشر تھے۔ ایک عرصہ تک اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی کتابوں کو شائع کرتے گئے۔ صدر الافاضل مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی کے ایک نامور شاگرد مفتی احمد یار خاں نعیمی گجراتی کی تحریروں کو بھی شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ غالباً سب سے پہلے مفتی صاحب کی ''جاء الحق''، ''تفسیر

نعیمی'' ''مراۃ شرح مشکوۃ'' ''شان حبیب الرحمٰن من آیات القرآن'' آپ ک اہتمام میں ہی زیور طبع سے آراستہ ہو کر اہل علم تک پہنچیں۔ پنجاب کے سنی سادا میں شیعہ نوازی کا رجحان بڑھ رہا تھا۔ بعض سید گھرانے شیعوں کی دیکھا دیکھی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر طعن کرتے۔ سید معصوم شاہ گیلانی نوری نے مفتی احمد یار خاں نعیمی سیدنا امیر معاویہ پر ایک جامع کتاب لکھنے پر آمادہ کیا، جو لکھی گئی اور بعد میں ہزارو کی تعداد میں چھپ کر تقسیم ہوئی۔ سید معصوم شاہ گیلانی نوری رحمۃ اللہ علیہ کی اس خاموش مگر موثر اعتقادی خدمات کے اثرات بڑے دوررس ہوئے۔

سید معصوم شاہ گیلانی کی زندگی کا ایک اور پہلو بڑا ہی قابل تحسین تھا۔ وہ مساج کی تعمیر میں عملی حصہ لیتے۔ جب ریلوے اسٹیشن کے سامنے بلند و بالا عمارتیں بنن لگیں تو سید معصوم شاہ گیلانی نے آگے بڑھ کر ایک شاندار مسجد بنا ڈالی، جس کا نا ''نوری مسجد'' رکھا گیا۔ اس مسجد میں ''مرکزی مجلس رضا'' کے تاریخی اجلاس ہوتے رہے اور یہی مسجد ایک عرصہ تک حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب، بانی ''مجلس رضا'' کی نگرانی میں ''مرکزی مجلس رضا'' کی اشاعتی سرگرمیوں کا مرکز بنی رہی۔ ''نوری مسجد'' کے علاو لاہور میں سید معصوم شاہ گیلانی نے بیس اور مساجد بھی تعمیر کرائیں۔ اسی طرح آپ لاہور کے علاوہ جس شہر یا قصبہ میں جاتے، مریدوں سے نذرانے جمع کرنے کی بجائے انہیں اللہ کا گھر بنانے پر لگا دیتے۔

مجھے سید معصوم شاہ گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس میں بیٹھنے کا موقع تو نہیں ملا مگر میں نے اکثر علماء اہل سنت کو اس بات کا معترف پایا کہ انہیں سید صاحب نے ہی تقریر و تحریر پر آمادہ کیا ہے اور ان کی ترغیب سے وہ اس راہ پر کامیابی سے گامزن ہوئے ہیں۔

سید صاحب کی ذاتی زندگی ایک خاموش درویش اور سالک کی زندگی تھی۔ ان کے ہزاروں عقیدت مند تھے، ہزاروں مرید تھے اور ہزاروں مداح تھے۔ ان کے عقیدت مندوں کا حلقہ ملک کے دور دراز علاقوں میں پھیلا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ حضرت دا

گنج بخش کے کئی ''مجاورین'' جو اپنی خصوصی نسبت کی وجہ سے کسی کو شمار قطار میں نہیں لاتے تھے، حضرت سید معصوم شاہ گیلانی نوری سے متاثر ہو کر بیعت ہوئے اور انہی کے زیر ہدایت اپنی زندگیاں گزار دیں۔

حضرت سید معصوم شاہ گیلانی کا ایک علمی کارنامہ آب زر سے لکھا جائے گا کہ انہوں نے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ اس وقت شروع کیا، جب پنجاب کے اکثر لوگ اعلیٰ حضرت سے متعارف نہ تھے۔ ان کی کتابوں کو پڑھنے والا کوئی نہ تھا، ان کی کتابوں کو خریدنے والا کوئی نہ تھا، حتیٰ کہ ان کی کتابوں کے ناموں کو صحیح سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔ سید صاحب اس اندھیری وادی میں شمع رضویت کو ہاتھ میں اٹھائے چلتے رہے۔ آج الحمدللہ اعلیٰ حضرت کے نظریات کو عام کرنے کے لیے کئی اشاعتی مراکز، کئی اشاعتی ادارے، کئی اشاعتی انجمنیں اور کئی لائبریریاں قائم ہو گئی ہیں اور دنیا بھر میں

ع ''گونج گونج اٹھے ہیں نغمات رضا سے بوستان''

کا سماں بندھ گیا ہے۔

آپ کی اشاعتی یادگاروں میں سے ''نوری کتب خانہ'' اور ''نوری بک ڈپو'' آج تک قائم ہیں۔ پھر آپ کے دو بیٹے سید محمد حسین شاہ نوری گیلانی اور سید محمد حسن شاہ نوری گیلانی آپ کے علمی اور روحانی مراکز کو آباد رکھے ہوئے ہیں۔

صائم چشتی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۲۲-۱-۲۰۰۰):

آج سے تیس سال قبل مجھے محکمہ صنعت پنجاب نے ''انڈسٹریل ڈویلپمینٹ آفیسر'' بنا کر فیصل آباد (لائل پور) مقرر کیا۔ ان دنوں محکمہ صنعت کا یہی افسر کئی ضلعوں کا نگران ہوتا تھا۔ پاکستان ان دنوں صنعتی انقلاب کے میدان میں قدم رکھ رہا تھا اور محکمہ صنعت کے ضلعی آفیسر کے بڑے اختیارات ہوتے تھے۔ ''سمندری روڈ'' پر انجینئرنگ کی صنعتی ترقی اپنا دامن پھیلا رہی تھی۔ مجھے کسی نے بتایا کہ ایک کارخانہ دار شاعر بھی

ہے اور نعت خواں بھی۔ دوسرے صنعت کار میرے پاس آیا کرتے تھے مگر میں اس "نعت خواں کارخانہ دار" کے پاس خود چل کر گیا۔ پہلی بار صائم چشتی مدظلہ العالی سے ملاقات ہوئی۔ ان دنوں ان کا نام شیخ محمد ابراہیم تھا۔ بس ایک نوعمر نوجوان۔ زلفیں لٹکی ہوئی اور داڑھی کا آغاز۔ ملاقات ہوئی۔ بڑے خلوص و محبت سے تبادلہ خیالات ہوا۔ معلوم ہوا کہ صائم چشتی نعت لکھتے ہیں، شعر کہتے ہیں اور حضرت پیر علی حسین علی پوری رحمۃ اللہ علیہ سے چشتی ہوتے ہوئے بھی گہری ارادت رکھتے ہیں۔

کئی سال بعد دوبارہ "فیصل آباد" گیا تو پتا چلا کہ صائم چشتی صاحب، کارخانہ داری چھوڑ کر منڈی میں تیل فروشی میں مصروف ہیں مگر تیل فروشی کے باوجود شعر وادب کا غلبہ رہا۔ تیسری بار فیصل آباد پہنچا تو صائم چشتی کے شعری اور علمی ذوق نے آپ کو تیل اور تیل کی دھار سے علیحدہ کر دیا۔ اب میں نے انہیں "چشتی کتب خانہ" جھنگ بازار میں مسند نشین دیکھا۔ اب میرا صبح و شام چشتی کتب خانہ میں آنا جانا ہوتا۔ دینی کتابوں کے حلقے میں صائم چشتی ایک خوبصورت نشست پر جلوہ فرما ہوتا۔ ایک خوبصورت حقہ گردش میں ہوتا اور علماء، شعراء اور طلبہ کا مجمع ہوتا۔ کتابوں کا لین دین ان کے بھائی فضل کریم نقشبندی مرحوم کرتے تھے اور چشتی صاحب حقے کے کش لگاتے رہتے۔ ہم جیسے مہمانوں کو "شربت دیدار" کے ساتھ ساتھ "شربت انجبار" پلاتے اور اہلِ سخن حضرات کو اپنے شعروں سے نوازتے۔ جن شعراء کا کلام کوئی نہ سنتا تھا، صائم صاحب انہیں اپنے حقے کی گڑگڑاہٹ کا شریک حال بنا کر ان کا کلام سنتے اور وہ شعراء "بشنواز نے چوں حکایت می کند" سے فائدہ اٹھا کر ساری نظم سنا جاتے۔ میں حقہ نوش نہیں تھا۔ میرے دفتر کے کمرے میں جو سگریٹ بھی لگاتا میں چپڑاسی کو اشارہ کرتا تو وہ اسے "ادب" سے باہر لے جاتا مگر "چشتی کتب خانہ" میں حقے کے دھوئیں کے مرغولوں کے دوران صائم چشتی کے اشعار اور ان کے رفقائے سخن کی نظمیں سنتا چلا جاتا۔ صائم چشتی کے ساتھ ایک عرصہ تک علمی رفاقت رہی۔ وہ اپنی غربت کے باوجود

احباب کی تواضع کرتے اور خوش بختی کے باوجود ان شعراء کے کلام کو سننے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ انہیں صائم چشتی کے بغیر کوئی نہ سنتا تھا۔ پھر انہیں خوش رکھنے کا سلیقہ بھی جانتے تھے۔

ع غم دل نگفتہ بہتر ہمہ کس جگر ندارد!

صائم چشتی پنجابی میں قادر الکلام شاعر ہیں۔ انہوں نے کم و بیش ۲۰۰ سے زیادہ مجموعہ ہائے شعر لکھے اور چھپوائے۔ اردو اور فارسی میں بھی ان کے اشعار نے اہلِ علم سے داد و تحسین وصول کی۔ آپ کی بعض نعتیں اور کتابیں تو زبانِ زد عام ہوئیں اور مقبول خواص و عام بنیں۔ شعر و سخن کے ساتھ ساتھ صائم چشتی نے نثری انداز میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھیں۔ پھر زندگی کے ایک موڑ پر آپ کا راہوار قلم عربی کی بلند پایہ کتابوں کے ترجموں کی طرف بڑھا۔

آپ نے "ابن عربی" کی فتوحات مکیہ، تفسیر خازن، تفسیر ابن عربی اور امام فخر الدین رازی کی "تفسیر کبیر" جیسی شہرہ آفاق کتابوں کے اردو ترجمے شروع کیے اور ساتھ ساتھ چھپوانے کا اہتمام کیا۔ وہ اس میدان میں اب تک رواں دواں ہیں۔ قدیم علمائے کرام مسائل علمیہ کی تشریح کے ساتھ ساتھ علم کیمیا اور علمِ طب سے دلچسپی لیتے رہتے ہیں۔ ہمارے صائم چشتی علم کیمیا پر تو عمل نہ کر سکے مگر لوگوں کے علاج معالجہ میں ایک کامیاب طبیب کی حیثیت سے علی الصباح مریضوں کی نبضوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ "مرض شناسی" کے ساتھ ساتھ "نبض شناسی" اور "دوا سازی" میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور سنا ہے کہ دوا اور دعا سے "ھو الشافی" کا مظہر ہیں۔

"صائم چشتی" وقت کے ان اہلِ قلم و سخن کے زمرہ کے فرد ہیں جو اپنی زندگی کو ہزاروں سالوں تک کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں کی روشنیوں میں صدیوں زندہ رہتے ہیں۔ غالب نے جن لوگوں کیلئے

ع تم سلامت رہو ہزار برس   ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

کا فارمولا دیا ہے، وہ یہی اربابِ تصنیف ہیں۔ صائم چشتی ایک گوشہ نشین اہل قلم ہیں۔ وہ اخباری اور دوسرے ذرائع ابلاغ سے بے نیاز کام کرتے جا رہے ہیں۔

میری مجلس میں بیٹھنے والے کئی ارباب علم وفضل ان کی تحریروں پر تنقید کرتے ہیں مگر تنقید انہی پر ہوتی ہے، جس کا کام سامنے آئے۔ جو حضرات علم وفضل کے باوجود ''جف القلم'' اور ''کف اللسان'' ہوں، ان پر تنقید کون کرے گا؟

صائم چشتی کی زندگی اس مشینی اور مصروف دور میں ان علماء کرام کے لیے بڑی سبق آموز ہے، جو علم وفضل کی دولت کے باوجود دنیا کی دولت کو ''ضروریات زندگی'' کا حصہ بنا کر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے ہیں۔ زکوٰۃ وصدقات کی چھتریوں کے سائے میں مدرسے چلاتے ہیں اور ''وعظ فروشوں کی منڈی'' میں اپنے آپ کو ''فخر الدین رازی'' اور ''امام ابوحنیفہ'' کا جانشین کہلاتے ہیں۔

''صائم چشتی'' کو اہلِ بیت سے محبت ہے اور بے پناہ محبت۔ انہوں نے اظہار محبت کے جذبہ کی تسکین کے لیے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ وہ اظہارِ محبت کے لیے الفاظ دلائل کی تلاش میں نکلے تو رافضی اور شیعہ مولفین کی کتابوں تک رسائی حاصل کر کے بعض مقامات پر اہل سنت کے ان متفقہ نظریات سے اختلاف کرتے چلے گئے جو صدیوں سے مستند اور اجماع اہلِ سُنّت کے طور پر تسلیم کیے گئے ہیں۔ انہوں نے ''خدمات ابوطالب'' سے متاثر ہو کر ''ایمانِ ابوطالب'' پر کتابیں لکھیں تو علماء اہل سنت نے انہیں شیعوں کا وکیل تصور کیا۔ وہ ''افضلیت علی'' کے سلسلہ میں وہی دلائل لائے جو ''تفضیلی سنیوں'' کا ایک طبقہ پیش کرتا رہتا ہے۔ ان ''غلطیہائے مضامین'' کے باوجود ''صائم چشتی'' کے قلم نے اس زمانہ کی ''شب تاریک'' میں روشنیاں پھیلائی ہیں۔

انہوں نے پنجابی میں ''خاتونِ جنت'' لکھی، اردو میں ''البتول'' لکھی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی افضلیت میں ''مشکل کشاء'' لکھی اور نصرت فتح علی خاں قوال کے طبلہ کی چوٹ پر ''علی علی دم علی علی'' کو دنیا بھر ''دما دم مست قلندر'' بنا دیا۔ ایک خارجی

اور ... محمد دین بٹ'' کی بدنام زمانہ کتاب ''رشید ابن رشید'' سے کبیدہ خاطر ہو کر ''شہید ابن شہید'' لکھی تو مقام حسین کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا۔

صائم نعت رسول پر مختلف انداز میں بات کرتے ہیں۔ وہ جب حضور کی مدحت بیان کرتے ہیں تو ان کی زبان وقلم سے کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں۔ وہ نعت لکھتے ہیں تو پھول کھل اٹھتے ہیں۔ وہ نعت کہتے ہیں تو بہاریں مسکرا پڑتی ہیں۔ ایک وقت آئے گا جب صائم کی کہی ہوئی نعتوں پر ''تحقیقاتی مقالے'' لکھے جائیں گے اور دنیائے نعت میں ان کی کوششیں داد وتحسین حاصل کریں گی۔

(''جہانِ رضا'' جولائی ۱۹۹۴ء)

لاہور کے پرانے جلسوں پر ایک نظر

لاہور دینی اور سیاسی معرکوں کا مرکز رہا ہے۔ لاہور سے اٹھی ہوئی تحریکیں، لا... کی محفلوں کی رونقیں اور لاہور کے دینی اور روحانی مراکز سارے پاکستان پر اثر ا... ہوتے ہیں۔ قیام پاکستان سے کچھ سال پہلے دو قومی نظریہ پر بڑے بڑے جلسے ہو... تھے۔ ان جلسوں میں ملک کے بلند پایہ رہنما اظہار خیال کرتے اور لوگوں کو سیاسی ا... قومی مسائل سے آگاہ کرتے تھے۔ میں ان دنوں ایک دینی مدرسے کا طالب علم ... جس طرح دینی مدارس کے طلبہ سوشل زندگی میں قدم رکھتے ہوئے ہچکچاتے ہیں، ... بھی اسی طرح سیاسی جلسوں اور ہنگاموں میں جاتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ مصری شاہ ... گورنمنٹ کالج کے ایک طالب علم صدیقی صاحب (نام دانستہ نہیں لکھ رہا) تھے، جو ... سے نکلتے اور مجھے ساتھ لیتے اور ہم دونوں ہر روز کسی نہ کسی جلسہ میں جا پہنچتے۔ صد... صاحب کی میرے ساتھ دوستی تھی اور میری ایک ادا کو بہت پسند کرتے تھے کہ جب کوئی جلسہ سن کر واپس آتے تو میں انہیں تقریر کرنے والے مقرروں اور لیڈروں ... تقاریر اس انداز میں سنایا کرتا تھا جس انداز اور آواز میں وہ لوگوں کے سامنے ... کرتے تھے۔ صدیقی صاحب کے لیے گویا میں گراموفون کا ایک ایسا ریکارڈ تھا ج... میں سیاسی تقریریں ہر انداز میں موجود ہوتی تھیں۔ وہ کبھی کبھی مجھے کالج میں ا... پروفیسروں کی محفل میں بھی لے جاتے جو سٹاف روم میں بیٹھے سیاسی لیڈروں کی تقریریں سن لیتے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری احرار کے جلسہ میں:

میں نے صدیقی صاحب کے ساتھ دہلی دروازے کے باہر باغ میں مولانا ...

عطاء اللہ شاہ بخاری کی وہ تقریر سنی تھی جو رات شروع ہوئی اور شاہ محمد غوث کی مسجد میں صبح کی اذان کی آواز پر ختم ہوئی تھی اور شاہ صاحب نے ''موذن بانگ بے ہنگام برداشت'' کہہ کر تقریر ختم کی۔ اس تقریر میں فاضل مقرر نے ''حکومت الٰہیہ'' کا فلسفہ پیش کیا اور مسلم لیگ کے پاکستان کے مطالبہ پر بڑے پر زور حملے کیے۔ شاہ صاحب کی قوت بیانیہ کا یہ کمال تھا کہ وہ ساری رات تقریر کرتے مگر کسی کو نہ تھکنے دیتے، نہ جانے دیتے۔ میں اس تقریر سے بڑا متاثر ہوا۔ مگر صدیقی نے مجھے بتایا کہ ''حکومت الٰہیہ'' دراصل اکبر کے ''دین الٰہی'' کا چربہ ہے۔ تم حضرت مجدد الف ثانی کے ماننے والے ہو، تم ''ابوالفضل اور فیضی'' کے لفظوں کے چکر میں کیوں آتے ہو۔ اپنا قبلہ درست رکھو۔

ان دنوں مجلس احرار نے عوام کا ایک لاکھ ستر ہزار روپے کا چندہ کھا لیا تو احرار کے ورکروں اور چندہ دینے والوں میں بڑی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ مجلس احرار کا ایک جلسہ دہلی دروازہ کے باغ میں تھا۔ مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی سٹیج پر بڑی زور دار تقریر کر رہے تھے۔ کسی نے آواز لگائی ''چندے کا حساب دو!'' مولانا رک گئے۔ سٹیج پر سناٹا چھا گیا۔ پھر بولے ''ہم چندہ لیں گے! حساب نہیں دیں گے! ہم ''احرار اسلام'' ہیں، بنیے نہیں کہ پائی پائی کا حساب رکھتے پھریں!'' مولانا کے اس رندانہ جواب پر احراری رضا کاروں کی طرف سے نعرے بلند ہوئے۔ ''چندہ لیں گے، حساب نہیں دیں گے!! چندہ لیں گے، حساب نہیں دیں گے!!'' نعرے رکے تو مولانا لدھیانوی پھر گرجے۔ ''چندے کا حساب پوچھنے والو! پہلے برٹش گورنمنٹ سے دوسری جنگ عظیم کے مظالم کا حساب لو! پھر احرار سے چندے کا حساب لینا''۔ رضا کاروں نے پھر نعرے بلند کیے اور سوال کرنے والا اپنا سا منہ لے کر جلسہ سے غائب ہو گیا!

لاہور میں جس طرح دہلی دروازہ کا باغ احراریوں کی جلسہ گاہ تھا، اسی طرح موچی دروازے کے باغ میں مسلم لیگ کے جلسے ہوتے تھے۔ ہم ''مسلم ہے تو مسلم

لیگ میں آ'' کے ترانے سنتے۔ ''ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح'' جیسی نظمیں سنتے۔ مجھے ان دنوں مسلم لیگی لیڈروں کی تقریریں پسند نہ آتی تھیں۔ کیونکہ یہ سب ''داڑھی منڈے'' تھے اور میں ''داڑھی منڈے'' کی تقریر کو پسند نہیں کرتا تھا۔ مگر میرے دوست صدیقی صاحب ان کی بڑی تعریف کرتے۔ ان ہی دنوں لوہاری دروازے کے باہر باغ میں مولانا محمد بخش صاحب مسلم بی۔ اے تقریر کرتے تھے۔ ان کا خطاب اکثر جمعہ کی نماز سے پہلے ہوتا۔ بڑا مجمع ہوتا۔ مولانا مسلم ''نظریہ پاکستان'' پر بات کرتے، احرار کے خلاف بولتے، قائداعظم کی تعریف کرتے اور پاکستان کے قیام کے فوائد بتاتے۔ وہ انگریزی، اردو اور پنجابی زبان میں تقریر کرتے۔ خوش آواز تھے، خوش بیان تھے۔ تقریر میں انگریزی کے جملے روانی سے بول جاتے اور بڑی پرسوز آواز میں شعر کہتے۔

کانگریسی لیڈروں کے جلسے:

ان دنوں موری دروازے کے باہر والے باغ میں کانگریسی، مہاسبھائیوں اور ہندوؤں کے جلسے ہوتے تھے۔ سارے ہندوستان سے ہندو لیڈر لاہور آتے۔ بڑے عجیب لباس میں نمودار ہوتے۔ ڈھیلی ڈھیلی دھوتیاں باندھے ہوئے چلے آتے۔ اور پاکستان کے خلاف زہر اگلتے۔ ہندو، سکھ، پارسی اور کانگریسی مسلمان ان کے ارد گرد جمع ہوتے۔ وہ انگریز کے خلاف بولتے مگر پاکستان اور بانی پاکستان کو برا بھلا بھی کہتے۔ میں نے ان ہی دنوں ''براڈلے ہال'' میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر سنی، جہاں کانگریسی لوگ جوق در جوق آئے تھے۔ میں نے انہی دنوں لاہور میں قائداعظم کی تقریر سنی۔ وہ اردو کم بولتے مگر انگریزی کے الفاظ پر جوش ہوتے اور ٹھہر ٹھہر کر علیحدہ ادا کرتے۔

Our God is separate. Our Rasool is separate. Our Religion is separate. Our Culture is separate. Therefore, we want a separate state in which we could live an Islamic life.

آپ کے ان الفاظ پر مجمعے میں شور برپا ہو جاتا۔ نعرۂ تکبیر بلند ہوتے۔ پاکستان زندہ باد کے نعرے لگتے۔ قائداعظم زندہ باد کے نعرے گونجتے۔ عام لوگ قائداعظم کی زبان نہیں جانتے تھے مگر ان کے ایک ایک لفظ پر نعرے بلند کرتے تھے۔

سخن میں سوز الٰہی کہاں سے آتا ہے
وہ چیز کیا ہے! جو پتھر کو بھی گداز کرے!

مولانا شبیر احمد عثمانی کی تقریر:

میں نے اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی کی وہ تقریر سنی، جو انہوں نے پاکستان بننے سے پہلے تشکیل پاکستان کے حق میں کی تھی اور بتایا تھا کہ یہ خطہ ایک دن سارے عالم اسلام کی خوشحالی کا گہوارہ ہوگا۔ ان کی تقریر بڑی مدلل، موثر اور دلنشین تھی۔ لوگوں نے بڑی پسند کی۔ دیوبندی خانوادہ میں صرف مولانا شبیر احمد عثمانی ایسے عالم دین تھے۔ جو سٹیج پر کھل کر پاکستان کے حق میں تقریریں کرتے تھے۔ مولوی اشرف علی صاحب تھانوی دوسرے چند دیوبندی عالم تھے، جنہوں نے پاکستان کے خلاف کبھی لب کشائی نہیں کی تھی۔ ورنہ دیوبندیوں کا یہ سارا خانوادہ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی قیادت میں پاکستان کی ''پ'' تک کے خلاف تھے۔ ان دنوں لاہور میں کانگریسی راہنماؤں کے ساتھ ساتھ ''نیشنلسٹ علما'' کے جلسے بڑے پرہجوم ہوتے تھے۔ ان کے شاگرد، ان کے مقتدی اور ان کے حلقۂ اثر کے لوگ آتے اور جلسے میں حاضرین کی تعداد بڑھاتے۔ وہ دھواں دھار تقریریں کرتے۔ لوگوں کے دماغ ان کے ساتھ تھے مگر دل پاکستان کے ساتھ تھے۔ میں نے صدیقی صاحب کے ساتھ مل کر ایسے لوگوں کی لچھے دار تقریریں سنیں، پھر رات کو گھر آکر ان پر غور بھی کیا مگر مجھے قائداعظم کی انگریزی کے چھوٹے چھوٹے جملے دل نشین ہوتے گئے۔ میں اس وقت انگریزی زبان سے ناآشنا تھا مگر قائداعظم کی انگریزی میرے دل میں اترتی جاتی۔

میں نے اسلامیہ کالج لاہور کی گراؤنڈ میں وہ جلسہ بھی دیکھا جہاں قائداعظم نے خطاب کرنا تھا اور جس جلسے کو خاکسار تحریک کے سالار اعظم علامہ عنایت اللہ المشرقی نے درہم برہم کر دیا تھا۔ میں نے علامہ عنایت اللہ المشرقی کو اسی مجمعے میں لوگوں کے ہاتھوں پٹتے ہوئے دیکھا۔ علامہ مشرقی کا اس دن عوام کے ہاتھوں بچ جانا ایک ایسا واقعہ تھا جسے میں آج تک نہیں سمجھ پایا۔

میں نے حافظ پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پوری کو پاکستان کے حق میں اور قائداعظم کی تعریف میں تقریر کرتے ہوئے سنا۔ وہ لچھے دار تقریر نہیں کرتے تھے۔ سیدھا سادا بیان اور سیدھے سادے الفاظ مگر ان کی بات جو سن لیتا، عہد کر کے اٹھتا کہ وہ پاکستان بنائے گا اور قائداعظم کے جھنڈے کے سایہ میں ہندوؤں اور انگریزوں کے خلاف لڑے گا۔ ان کے جلسہ میں ہزاروں نہیں لاکھوں عقیدت مندوں کا مجمع ہوتا تھا۔

مجلس احرار کے جلسے:

مجلس احرار اسلام کے جلسے بڑے پر رونق ہوتے تھے۔ ان کے مقرر شعلہ بیان تھے۔ ان کے لیڈر آتش بہ لب تھے۔ ان کا ہر ایک مقرر زبردست خطیب تھا۔ ہر مقرر منفرد طرز بیان کا مالک تھا۔ میں نے سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کی قیادت میں احراری مقررین کی تقریریں سنیں۔ ہر ایک مقرر دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بولتا۔ مولوی محمد علی جالندھری، چوہدری افضل حق، شیخ حسام الدین امرتسری، ماسٹر تاج دین انصاری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، صاحبزادہ سید فیض الحسن، مولوی مظہر علی اظہر، مظفر علی شمسی اور آغا شورش کاشمیری شعلہ بیاں مقرر تھے۔ مگر یہ لوگ پاکستان کے خلاف تقریریں کرتے تھے۔ قائداعظم کو برا بھلا کہتے اور ہندوؤں کی ہمنوائی میں دھواں دھار تقریریں کرتے۔ وہ مسلمانوں کے جذبہ ایمانی اور تحریک آزادی وطن سے بے خبر تھے۔ وہ محراب و منبر میں کھڑے ہو کر بھی گاندھی اور نہرو کی تعریف کرتے اور مسلمانوں کو علیحدہ مملکت حاصل کرنے سے ڈراتے تھے۔ میں ان شعلہ بیانوں کی

تقریریں سننے پہنچ جاتا مگر ان کے خیالات سن کر دل کڑھتا۔ میں نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی دہلی پہنچ کر اس جلسے میں تقریر سنی، جس کے دوران انہیں مشہور دیوبندی عالم دین مولوی اشرف علی تھانوی کی موت کی خبر پہنچی تھی اور انہوں نے موضوع سے ہٹ کر مولوی اشرف علی تھانوی کو ہدیۂ تحسین پیش کیا۔ میں نے لکھنؤ میں ان کی وہ تقریر سنی جس میں انہوں نے جمعیۃ علماء ہند کے جھنڈے کے نیچے لوگوں سے پاکستان کی مخالفت کا عہد لیا۔ میں نے رام تلائی سیالکوٹ میں ان کی وہ تقریر بھی سنی، جس میں وہ پاکستان کے لفظ پر لطیفے سناتے رہے۔ احراری مقررین کی تقریریں سننے کے لیے میں شاہ محمد غوث کے سامنے مجلس احرار کے دفتر میں جانے لگا۔ وہاں میرے کچھ دوست احرار کے دفتر میں مختلف فرائض سرانجام دیتے تھے۔ میں نے ان شعلہ بیانوں کو بھنے ہوئے مرغے اڑاتے دیکھا۔ مجھے صدیقی صاحب نے کئی بار ٹوکا کہ احرار کے صرف جلسے دیکھا کرو، دفتر میں نہ جایا کرو۔ مگر میں آنے بہانے دفتر میں چلا ہی جاتا۔ دسترخوان پر مرغ اڑتے دیکھتا اور تلی ہوئی مچھلی کے تر نوالے دیکھے بغیر نہ رہتا۔

مسلم لیگ کے جلسے:

میں نے مسلم لیگ کے جلسے دیکھے۔ یہ جلسے زیادہ تر لاہور موچی دروازے کے باغ میں ہوا کرتے تھے۔ اگرچہ مسلم لیگی رہنما اشتعال انگیز تقریریں نہیں کرتے تھے مگر خضر حیات ٹوانہ کی حکومت تحریک پاکستان پر لوگوں کو یکجا کرنے سے روکتی تھی۔ کبھی کبھی وہ لاٹھی چارج بھی کرا دیتی اور دفعہ ۱۴۴ کی آڑ میں رضا کاروں کو جیل میں بھی لے جاتی۔ ان جلسوں میں میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ، نواب ذوالفقار علی خان آف ممدوٹ، سردار عبدالرب نشتر، خان عبدالقیوم خان، خان لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، مولانا محمد بخش مسلم، نواب زادہ رشید علی خان اور بنگال اور یوپی کے مقتدر مسلم لیگی لیڈر تقریریں کرتے اور لوگوں کو پاکستان حاصل کرنے کی اہمیت پر زور دیتے۔

لاہور کے دینی جلسے:

ان سیاسی جلسوں سے ہٹ کر لاہور میں دینی اور مذہبی جلسوں کی رونقیں بھی نہ تھیں۔ علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ مرکزی دارالعلوم حزب الاحناف لاہور کا سالانہ جلسہ مسجد وزیر خان میں کراتے تھے۔ یہ جلسہ دراصل دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہونے والے علماء کو دستار فضیلت (تقسیم اسناد) دینے کی تقریب کے طور منایا جاتا تھا مگر علامہ ابوالبرکات اسے تین دن مناتے۔ ہندوستان بھر سے سنی علماء کرام کو دعوت خطاب دیتے۔ ملک بھر کے اہل ذوق کو شرکت کے لیے بلاتے۔ اس طرح لاہور کے کوچہ و بازار سنی علماء اور سامعین سے پررونق ہو جاتے۔ میں نے ان جلسوں میں حضرت محدث کچھوچھوی، صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی، حافظ پیر جماعت علی شاہ علی پوری، شیخ الحدیث مولانا سردار احمد فیصل آبادی (ان دنوں آپ بریلی سے تشریف لایا کرتے تھے)، مولانا قطب الدین جھنگوی، پیر ولایت شاہ صاحب گجراتی، صدر الشریعت مولانا محمد امجد علی صاحب اعظمی (مولف بہار شریعت)، مولانا ابوالحسنات قادری، مولانا محمد یار چشتی نظامی فریدی، مولانا عبدالغفور ہزاروی، علامہ احمد سعید کاظمی، مفتی احمد یار گجراتی، مولانا حشمت علی خان صاحب جیسے ناموران اہل سنت کو ان جلسوں میں سنا۔ ابوالنور مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں، مولانا غلام دین انجمن شیڈ، حافظ مظہر الدین اور دوسرے نوجوان علماء ان دنوں ابھرتے ہوئے مقرر تھے، جو اس سٹیج پر تعارفی تقاریر کیا کرتے تھے۔ آگے چل کر ان حضرات نے علمی اور روحانی مراکز میں بڑا نام پیدا کیا اور اپنے اپنے مقام پر قد آور علماء دین نظر آئے۔

مسجد وزیر خان کے جلسے:

علامہ سید ابوالبرکات اپنے جلسے کے انتظامات کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ہر ایک عالم دین کے لیے ریلوے سٹیشن پر استقبال کرنا، خود جا کر بڑے اہتمام سے جلسہ گاہ

لایا جاتا۔ اس جلسہ گاہ کا سٹیج ایک سو سے زیادہ نشستوں کا سٹیج ہوتا تھا۔ منقش قالینوں پر اس سے زیادہ رنگین تو شک اور گاؤ تکیے سجے ہوئے ہوتے۔ علماء کرام ان نشستوں پر جلوہ فرما ہوتے اور ان کے سامنے خوبصورت پاندان، اگالدان، سبز الائچی اور سفید مصری کی خوبصورت ڈلیاں بکدار طشتریوں میں رکھی ہوتیں۔ کبھی کبھی عطر گلاب کا خوبصورت چھڑکاؤ ہوتا تو جلسہ گاہ مہک اٹھتا۔ سید ابوالبرکات ہر عالم دین کے پاس بہ نفس نفیس حاضر ہو کر آداب خدمت بجا لاتے۔ مجھے کئی بار ان جلیل القدر علماء کرام کی قربت کا موقع اس طرح ملتا کہ میں بھی ان خدام کے زمرے میں شامل ہو جاتا جو سٹیج پر جلوہ فرما علماء کرام کی خدمت پر مامور ہوتے۔ اس طرح سٹیج پر کھڑے کھڑے حدنگاہ تک پھیلے ہوئے ان سامعین کے نورانی چہروں کی ایک جھلک دیکھ لیتا جو ملک کے گوشے گوشے سے آتے تھے۔ میں نے ایسے سیکڑوں سنی علماء کرام کو دستار فضیلت سر پر سجاتے دیکھا ہے جو آگے چل کر علم و فضل کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکتے رہے ہیں۔

دیوبندی جلسے:

اہل سنت کے اس مثالی اجتماع کے علاوہ دیوبندی علماء کرام کا سالانہ اجتماع شیرانوالہ دروازہ کی اس مسجد میں ہوتا جو مولوی احمد علی صاحب لاہوری کے دم قدم سے آباد تھی۔ مولوی احمد علی لاہوری نے اپنی تقریر و تحریر کی بدولت اس مسجد کو دیوبندیوں کا مرکز بنا دیا تھا۔ مولانا لاہوری کی وجہ سے اس مسجد میں سارے برصغیر کے جید علمائے دیوبند آتے اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولوی احمد علی لاہوری نے اپنی زبان و قلم سے عقائد دیوبند کی اشاعت میں جتنا حصہ لیا ہے، اس کی مثال دیوبندیت کی پوری تاریخ میں شاید ہی ملے۔

وہابی جلسے:

وہابیوں کے جلسے لاہور شہر کے درمیان چینیانوالی مسجد میں ہوا کرتے تھے۔

مولوی عبدالواحد صاحب ان جلسوں کا اہتمام کرتے تھے۔ ان جلسوں میں بڑے بڑے سخت جان اور کرخت بیان وہابی آتے تھے مگر ان دنوں پنجاب میں وہابیت کا زور نہ تھا اور نہ سعودیہ کے پاس اتنا روپیہ پیسہ تھا کہ ان لوگوں کو "دانہ دنکا" ڈال سکے۔ یہ جلسہ ہوتا۔ وہابی علماء بدعت اور شرک پر تقریریں کرتے اور چلے جاتے۔

شیعہ مجالس:

شیعہ طبقے کے لوگ لاہور میں جلسے تو نہیں کرتے تھے، مگر ان کے ماتمی اجلاس منعقد ہوا کرتے تھے۔ شیعوں میں اتفاق اور تنظیم کا یہ عالم تھا کہ ان کے ماتمی جلسوں میں رونے دھونے کے لیے سارے شہر کے شیعے جمع ہو جایا کرتے تھے۔ ان جلسوں کی رونقیں بس رونے دھونے اور آہ و فغاں سے معمور ہوتی تھیں۔ شیعوں کے مقرر اور ذاکر فصاحت و بلاغت میں طاق تھے۔ وہ ایک ایک لفظ سے کئی کئی معنے تراشتے اور انہیں کئی کئی انداز میں بیان کر جاتے۔ اگر ان کی مجلسوں سے رونے دھونے کی آواز نکال دی جائے تو فصاحت و بلاغت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک سمندر ہوتا جو لکھنوی ادب کی چاشنی بکھیرتا جاتا۔

اک رنگ کا مضموں ہو، سو رنگ سے باندھوں!

قادیانی جلسے:

مرزائی ان دنوں انگریز کی چھتری کے سایہ میں قادیان سے نکل کر لاہور آ جمع ہوتے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی موت بھی لاہور کے اس علاقہ میں ہوئی تھی جو اکبری دروازے کے باہر رام گلیوں کا علاقہ کہلاتا ہے۔ بس یہاں ہی ان کے اجلاس ہوتے۔ یہاں ہی "وحی" نازل ہوتی اور یہاں سے ہی مرزائی عقائد کی اشاعت ہوتی تھی۔ مرزائیوں کے جلسے، عوامی جلسے نہیں ہوتے تھے، بس کمروں میں اجتماع کی صورت تھے۔ ان کا ہر مقرر "صحابی" ہوتا اور ہر سامع بھی "صحابی" کہلاتا۔ میں نے مرزا محمود

[illegible] کو یہاں ہی آتے جاتے دیکھا۔ پھر دیکھتے دیکھتے ہی "قادیانی مرزائی" اور "لاہوری مرزائی" علیحدہ علیحدہ ہو گئے اور ان کی اجتماعیت میں انتشار پیدا ہو گیا اور اہل قادیان نے یہاں آنا جانا بھی چھوڑ دیا۔

روحانی مجالس:

لاہور میں سیاسی اور دینی جلسوں کے علاوہ "روحانی مجالس" بھی منعقد ہوا کرتی تھیں۔ ان کا ایک اپنا انداز تھا۔ ان روحانی مجالس کی رونقیں بزرگان طریقت کی آمد سے دوبالا ہو جایا کرتی تھیں۔ ذکر و فکر کے یہ اجتماع بڑے ایمان افروز ہوتے اور دلوں کی دنیا کو آباد رکھتے۔ ان روحانی مجالس کی تفصیلات ایک مستقل مضمون کا تقاضا کرتی ہے۔ اگر موقع ملا تو ہم اپنے قارئین کو ان محافل میں لے جائیں گے۔ ان شاء اللہ۔

نہ دیکھ ان خرقہ پوشوں کو ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لیے پھرتے ہیں اپنی آستینوں میں

("جہانِ رضا" جولائی ۱۹۹۴ء)

اہلِ سنت کے جلسوں پر ایک نظر

حضرت سید محمد محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ:

حضرت سید محمد محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے ۱۹۳۹ء میں ''مرکزی انجمن حزب الاحناف'' کے سالانہ جلسہ میں مسجد وزیر خان لاہور کی شاندار اسٹیج پر پہلی بار دیکھا تھا۔ آپ سر پر ''شاہی تاج'' سجائے، گیروا لباس پہنے، تقریر کے آغاز میں ایک خوبصورت منبر پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔

میں نے زندگی میں پہلی بار ایک عالم دین کے سر پر ''شاہانہ تاج'' (شاہ جہانی تاج) سجے دیکھا تو حیرت زدہ ہو گیا۔ حضرت محدث کی آنکھوں کی سرخی اور ان کے چہرے کا جلال یوں دکھائی دیتا تھا، جیسے واقعی ایک زبردست شہنشاہ اپنے وزراء، امراء کے حلقہ میں اپنی رعایا کو خطاب کر رہا ہو۔ حضرت کی آواز سے مسجد وزیر خان کے در گونج رہے تھے جس سے در و دیوار روشن تھے۔ خطبہ کے الفاظ کی ادائیگی اتنی پر اثر تھی کہ سامعین دم بخود تھے۔ مسجد وزیر خان کا وسیع صحن سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یہ سامعین عامی نہیں تھے، اہل علم و فضل تھے۔ اہل ذوق و محبت تھے۔ محدث صاحب کی تقریر فصاحت و بلاغت کا ایک نمونہ تھی۔ آپ کا انداز بیان اہل علم کے لیے غذائے روح تھا۔ آپ کا خطاب آدھ گھنٹہ یا ایک گھنٹہ نہیں، رات ڈھلنے تک جاری رہا۔ سامعین ہمہ تن گوش بیٹھے رہتے اور ہنستے رہتے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مسجد وزیر خان کا صحن اہل ذوق، اور سامعین سے لبالب بھرا ہوتا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب تشنگان علم و فضل ''نوشانوش'' کی آواز پر اُمڈے آتے تھے۔ یہ اس زمانے کی یاد ہے جب سامعین شب ہجراں کے ماروں کی طرح جاگتے رہتے تھے اور تقریریں

سنتے رہتے تھے۔

شب ہجراں کے جاگنے والو — کیا کرو گے اگر سحر نہ ہوئی

حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت علامہ سید ابوالبرکات رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے نامور فرد تھے۔ علامہ ابوالبرکات اسی خانوادہ کی نسبت سے ''اشرفی'' کہلاتے تھے۔ حضرت علامہ سید ابوالبرکات بایں علم و فضل محدث کچھوچھوی صاحب کے لیے آنکھیں فرش راہ بنائے رکھتے اور دست بستہ خدمت کے لیے کھڑے رہتے۔

پاکستان بننے کے بعد حضرت محدث کچھوچھوی جب لاہور آتے تو ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب، بل روڈ، لاہور کے مالک ملک عارف مرحوم کے ہاں قیام فرماتے اور ہم زیارت کے لیے وہاں ہی حاضر ہوتے۔ انہی مجالس نے ہمیں ذوق زیارت اور ذوق تقریر عطا کیا۔ انہی مجالس نے ہمیں اہل اللہ کی دید کا مشتاق بنایا۔

حضرت محدث رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں کا سلسلہ ہندوستان کے علاوہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں پھیلا ہوا تھا۔ بہاولپور اور اس کے مضافات میں آپ کے عقیدت مندوں کی بڑی تعداد تھی۔ آپ پاکستان آتے تو بہاولپور اور اس کے قرب و جوار میں علمی اور روحانی روشنیاں بکھیرتے۔ مجھے کئی بار اس علاقہ میں جا کر بھی آپ کی تقاریر سننے کا موقع ملا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ سفر کرتے تو فصاحت و بلاغت آپ کے ہم رکاب ہوتے۔ جہاں جاتے، عزت و شہرت قدموں میں بچھی جاتی۔ تقریر کرتے تو مجمع پر سکوت چھا جاتا، قرآن پڑھتے تو دل دہلتے جاتے۔ نگاہ اٹھاتے تو لوگ بے تاب ہو ہو جاتے۔

مولانا محمد حسین صاحب نعیمی نے اپنے ''دار العلوم نعیمیہ'' (چوک دالگراں) کے ایک جلسے پر حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت خطاب دی، مجھے سپاسنامہ پڑھنے کا حکم دیا۔ میں نے بڑا زوردار سپاسنامہ لکھا اور بڑے عمدہ الفاظ میں ترتیب دیا اور والہانہ انداز میں پڑھا۔ مگر حضرت محدث نے جلسۂ عام میں مجھے سخت سست کہا۔ جلسے

کے اختتام پر حضرت نے مجھے اپنے پاس بلایا اور فرمایا: ''کسی کو سامنے بٹھا کر اتنا
نہیں کرنا چاہیے۔ اس سے تکبر کی خو پرورش پاتی ہے۔ پھر تم تو ابھی بچے ہو، اتنی
باتیں نہیں کرنا چاہیے''۔ اس کے باوجود انہوں نے مجھے شفقت سے دعائیں دیں
میرے سر پر رکھا۔

حضرت محدث رحمۃ اللہ علیہ عوام میں تقریر کرتے، علمائے کرام کی محفل میں جلوہ
کرتے، خصوصی مجالس میں مشکل مسائل کی عقدہ کشائی فرماتے، رات آتی تو معمول
کے وظائف ادا کرتے اور رات کا خاصا حصہ اللہ کی بارگاہ میں سربسجود ہو کر گزارد
میں نے دولت مندوں اور وقت کے رؤسا کو ان کے دروازے کے سامنے
باندھے کھڑے پایا مگر آپ کو کسی وزیر، امیر کی ''زیارت'' کے لیے کہیں جاتے
دیکھا۔ نواب آف بہاولپور آپ کے عقیدت مند تھے مگر ساری زندگی آپ کو کبھی
صاحب کے محل میں قدم رکھتے نہیں دیکھا۔ آج میں اپنے وقت کے علماء کو چھو
چھوٹے دنیاداروں اور بدقماش وزیروں کی کوٹھیوں میں خوش خوش آتا جاتا دیکھتا
تو حضرت محدث یاد آتے ہیں۔

حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے علم وعرفان سے برصغیر کے ہر خطے
مسلمانوں کو حصہ دیا۔ دلوں کو عشق مصطفیٰ کی شمع کی روشنیاں دیں۔ تحریک پاکستان
صف اول میں کھڑے ہو کر پاکستان کی حمایت کا اعلان کیا۔ صرف سیاسی نہیں،
اہمیت کے پیش نظر آپ نے نظریہ پاکستان کے وجود کو ضروری قرار دیا اور اس کی
سارے ملک میں کی۔ علمائے اہل سنت اور مشائخ کو حصول پاکستان کے لیے ۱۹۴۶
میں ''سنی بنارس کانفرنس'' میں اکٹھا کیا اور ایک تاریخی قرارداد پاس کر کے قائداعظم
یقین دلایا کہ ان کی پاکستان کے لیے خدمات قابل قدر ہیں اور اعلان کیا کہ
خدانخواستہ قائداعظم کسی مقام پر سیاسی دباؤ میں آکر قیام پاکستان کے مطالبہ
دستبردار بھی ہو جائیں تو برصغیر کے اہل سنت پاکستان کے قیام سے کبھی کنارہ کشی نہیں

گے۔ حضرت محدث کچھوچھوی کی سیاسی بصیرت اور خدمات کو قائداعظم بے حد
سے دیکھتے تھے اور یہی وہ خدمات ہیں، جو سنہری حروف میں لکھی جائیں گی۔

مولانا احمد دین درگاہی رحمۃ اللہ علیہ:

پاکستان بننے سے آٹھ سال پہلے مجھے ریاست بہاولپور کے ایک شہر ہارون آباد
میں قیام کا موقع ملا۔ وہاں مجھے مرکزی جامع مسجد کے خطیب مولانا احمد دین درگاہی
سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ مولانا درگاہی، ضلع گجرات کے ایک گاؤں بیگہ مروج پور کے
رہنے والے تھے۔ بڑے باوقار اور بہادر عالم دین تھے۔ وہ اتنی بڑی مسجد میں اپنی
خطابت کی وجہ سے ساری ریاست بہاولپور میں مشہور ہوئے۔ آپ شیخ الجامعہ، علامہ غلام
محمد گھوٹوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اور دارالعلوم حزب الاحناف لاہور سے سید ابوالبرکات
سے حدیث پڑھی تھی۔ وہ مجھے بتایا کرتے تھے کہ انہوں نے سید دیدار علی شاہ الوری
سے بھی درسی کتابیں پڑھی تھیں۔ ابوالنور مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں، مولانا نور اللہ
صاحب نعیمی اور مولانا غلام دین آف انجن شیڈ لاہور آپ کے ہم درس تھے۔ وہ جب
ہارون آباد سے حج بیت اللہ شریف کو گئے تو آدھا شہر آپ کو الوداع کہنے کے لیے امڈ آیا۔

آپ نے ۱۹۴۴ء میں ایک زبردست جلسے کا اہتمام کیا اور اتنی محنت کی کہ ہارون
آباد کے علاوہ بہاولنگر، چشتیاں، فقیر والی، فورٹ عباس کے سارے دیہات کے لوگ
جلسے میں قطار در قطار پہنچے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سیکڑوں سانڈنی سوار ریگستانوں کو
عبور کرتے ہوئے جلسہ گاہ میں شریک ہوئے تھے۔ اس جلسہ میں، میں مولانا غلام علی اوکاڑوی
(ان دنوں وہ غالباً جالندھر سے آئے تھے) مولانا غلام قادر اشرفی لالہ موسیٰ، مولانا غلام
دین لاہور، مولانا محمد بخش مسلم بی۔ اے نے بھی خطاب کیا جب کہ صدارتی خطبہ
حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا۔ ریاست بہاولپور کے اس ریگستانی علاقہ
میں اتنے بڑے بڑے علماء کرام کا جمع ہونا ایسا ہی تھا، جیسے لق ودق صحرا میں ابر بہاری
ٹوٹ کر برسے۔ مولانا درگاہی اس جلسہ کے منتظم اعلیٰ بھی تھے اور سٹیج کے سیکرٹری بھی۔

مولانا درگاہی، ہارون آباد کی جامع مسجد کے ان دنوں خطیب تھے۔ جب مسجد کے محراب و منبر کے حسن و جمال کو نکھارا جا رہا تھا۔ کچا فرش، بلند و بالا مینار اور سادہ دیوار بنائے جا رہے تھے اور پانی کی قلت تھی۔ جب مسجد مکمل ہوئی تو اس میں وقت کے بلند پایہ خطیب اور علماء اہلسنت نے وہاں دینی تربیت کا کام کیا مگر مولانا احمد دین درگاہی کا زمانہ بڑا سنہری زمانہ تھا۔

پاکستان بننے سے پہلے مجھے ہارون آباد کے مضافات میں ایک دارالعلوم ''تعلیم الاسلام'' میں دینی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ میں گاہے بگاہے مولانا درگاہی کی خدمت میں حاضر ہوتا تو وہ بڑی شفقت فرماتے۔ میں لاہور آ گیا، تو جب بھی لاہور آتے، ملاقات کا موقع دیتے اور میری علمی خدمات کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ جب وہ جسمانی عوارض کے ہاتھوں تنگ آ کر اپنے گاؤں بیگہ میں صاحب فراش ہوئے تو ان کی یادیں ان کے ایک عزیز کی وساطت سے باد بہاری بن کر لاہور چلی آتیں۔

مجھے یاد ہے کہ مولانا کی شادی پر علماء اہلسنت کی ایک کثیر تعداد براتی بن کر شریک ہوئی تھی۔ یہ ان کی ملنساری کا ثمرہ تھا کہ بڑے بڑے معروف علماء کرام براتی بنے۔ مولانا غلام قادر اشرفی آف لالہ موسیٰ کو خدا معلوم کیا سوجھی کہ مولانا درگاہی کے لیے برات کے جلوس ایک بیل گاڑی پر لاؤڈ سپیکر نصب کر دیا گیا۔ براتی علماء کرام گلی کوچوں میں رک رک تقریر کرتے جاتے۔ جب برات کا جلوس دلہن کے گھر کے سامنے پہنچا تو مولانا غلام قادر اشرفی نے اعلان کیا کہ اب دولہا میاں مولانا احمد دین درگاہی تقریر کریں گے۔ درگاہی صاحب کی فرمانبرداری ملاحظہ ہو کہ انہوں نے دولہا ہوتے ہوئے بھی دلہن کے دروازے کے سامنے اتنی پرجوش تقریر کی کہ سارا علاقہ گونج اٹھا اور اس طرح ہم دولہا کو لے کر دلہن کے گھر پہنچے۔

پاکستان بنا۔ قادیانیوں نے ملک کے اعلیٰ مناصب پر قبضہ کر لیا۔ وزارت خارجہ اور ایئر فورس کی ہر شاخ پر مرزائی بیٹھا نظر آتا۔ مرزائیوں نے ملک میں اتنی بالا دستی

حاصل کر لی کہ لوگ تنگ آ گئے۔ ''تحریک ختم نبوت'' چلی تو مولانا درگاہی، ہارون آباد میں قادیانیوں کے خلاف میں جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ پولیس نے گرفتار کرنا چاہا مگر ہتھکڑی ہاتھوں پر پوری نہ آتی تھی۔ آپ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے کہا: ''راہ حق میں گرفتار ہونے والوں کو زنجیروں کی ضرورت نہیں۔ آؤ میں خود جیل جاؤں گا''۔ مولانا درگاہی کی جرات رندانہ آج بھی ہارون آباد کے ہزاروں شہریوں کو یاد ہے۔

مولانا کی وضع داری اور ملنساری کی عادت سنی علماء کرام میں منفرد تھی۔ وہ اپنے ساتھی سنی علماء کرام کے ساتھ ہوتے تو یوں معلوم ہوتا کہ وہ ایک خادم ہیں۔ احباب کا ذکر کرتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے وہ اپنے پیرومرشد کا ذکر کر رہے ہیں۔ تقریر کرتے تو ان کی گرج اور للکار کسی سے کم نہ ہوتی۔ آخری عمر میں صاحب فراش ہو گئے اور کئی سال تک احباب اور ارباب علم سے کٹے رہے، مگر اپنے ایک عزیز کی وساطت سے اپنی یادوں کو لاہور پہنچا کر دل و دماغ کو زندہ کر دیتے۔

مولوی شمس الدین مرحوم:

مولوی شمس الدین مرحوم نہ مولوی تھے، نہ خطیب، نہ شاعر تھے، نہ ادیب۔ میں نے ان کی تقریر کبھی نہیں سنی۔ انہیں تقریر کرنا آتی نہیں تھی۔ میں نے ان سے کوئی شعر نہیں سنا، وہ شعر نہیں کہتے تھے۔ میں نے ان کی کوئی تصنیف نہیں دیکھی، وہ اہل قلم نہیں تھے۔ مگر میں نے ان کی مجلس میں ہمیشہ علماء، فضلاء، خطباء و اہل تحقیق اور اہل قلم کو انہیں گھیرے میں لیے ہوئے دیکھا۔ وہ مسلم مسجد لاہور کے نیچے نادر کتابوں کی ایک دکان کے مالک تھے۔ ان کے پاس نادر و نایاب کتابوں کا ذخیرہ تھا اور کتاب کے متلاشی اور کتاب سے محبت رکھنے والے ارباب علم ان کی دکان میں بیٹھتے اور پہروں نادر اور نایاب کتابوں پر گفتگو کرتے۔

مولوی شمس الدین مرحوم عالم دین نہیں تھے مگر وہ کتابوں کے عالم تھے۔ آپ کسی کتاب کے متعلق گفتگو کریں، مولانا آپ کو بتائیں گے کہ اس کتاب کے کتنے ایڈیشن

چھپے، کہاں کہاں چھپے، کب کب چھپے اور کون سا ایڈیشن اعلیٰ ہے۔ مولانا جب کتابوں کے بارے میں گفتگو کرتے تو یوں معلوم ہوتا کہ صدیوں کے کتابی خزانے ان کے سامنے ہیں اور ان کے ایک ایک ورق سے واقف ہیں۔

مولوی شمس الدین مرحوم عالم نہ تھے مگر علماء کا مجمع ان کی دکان پر ہر وقت رہتا۔ وہ عالم نہ تھے مگر لاہور میں ہر آنے والا عالم دین انہیں سلام کرنے جاتا۔ مولوی شمس الدین مرحوم عالم نہیں تھے مگر پاکستان کا کوئی عالم دین جس نے ایک کتاب بھی پڑھی تھی، آپ سے واقف تھا۔ وہ صرف کتاب شناس ہی نہ تھے بلکہ کتاب سے محبت کرنے والے حضرات کی قدر کرتے، عزت دیتے، وقت دیتے اور تواضع بھی کرتے۔ وہ اگرچہ غریب دکاندار تھے مگر اہل علم کی خاطر تواضع میں، جو کچھ ہاتھ میں آتا خرچ کر دیتے۔ میں نے کئی ایسے مولویوں کو ان کی دکان پر بیٹھے دیکھا، جو بات کتاب کی کرتے مگر فرمائش مرغ بریانی کی کرتے۔ مولوی شمس الدین ''نعمت کدہ ہوٹل'' سے اعلیٰ قسم کے مرغاب اور بریانی منگوا کر پیش کرتے۔ وہ کھا کر جب دانتوں میں پھنسی ہوئی بوٹیاں نکالتے تو ہمیں ان مولویوں پر غصہ آتا کہ یہ غریب مار کرنے والے مولوی کہاں سے آجاتے ہیں۔ ہم فاقہ زدہ مولوی شمس الدین کی مہمان نوازی پر ناراض ہو کر انہیں ایسی حرکت سے روکتے، تو وہ نہ ہمیں جواب دیتے نہ مرغ بریانی کھانے والوں سے ہاتھ کھینچتے!

مولوی شمس الدین مرحوم کی دکان اہل علم و فضل کا مرجع بنی ہوئی تھی۔ مجھے بڑے بڑے اہل علم اور ''اہل کتاب'' سے اسی دکان سے شناسائی حاصل ہوئی۔ میں نے ممتاز حسن مرحوم (گورنر سٹیٹ بنک) کو کتابوں سے گرد جھاڑتے دیکھا۔ میں نے میر علی احمد خاں تالپور مرحوم (وزیر دفاع پاکستان) کو مولوی صاحب سے کتابیں خریدتے دیکھا۔ میں نے بشیر حسین صاحب ناظم (ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل وزارت امور مذہبی پاکستان) کو کتابوں کی ورق گردانی کرتے دیکھا۔ میں نے سید شرافت نوشاہی

(مؤلف شریف التواریخ) کو گھنٹوں یہاں بیٹھے دیکھا۔ میں نے ملک محمد لطیف مرحوم (مؤلف اولیائے لاہور) کو نادر کتابوں پر بحث کرتے یہاں سنا۔ میں نے مولانا غلام رسول مہر (مدیر انقلاب) کو کتابوں کی جستجو میں دیکھا۔ میں نے نواب زاہد حسین (صادق آباد) کو ہزاروں روپوں کی کتابیں خریدتے دیکھا۔ میں نے حکیم محمد موسیٰ امرتسری (بانی مرکزی مجلس رضا) کو یہاں اٹھتے بیٹھتے دیکھا۔ میں نے یہاں مولانا محمد عالم مختار حق، احسان دانش مرحوم، مولانا محمد بخش مسلم مرحوم، محمد اقبال مجددی، علامہ مرزا غلام قادر، مخدوم غلام جیلانی، سید اصغر علی شاہ جعفری، ڈاکٹر فقیر محمد فقیر مرحوم، مولانا محمد دین رضوانی مرحوم (ریاض شاہد کے والد) اور کالجوں کے پروفیسروں اور سیکڑوں کتاب دوست حضرات کو اسی دکان میں کتابوں کی تلاش میں سرگرم پایا۔

پرانی اور نادر کتابوں کے تاجروں کے برعکس مولوی شمس الدین مرحوم نہ صرف کتاب شناس تھے بلکہ وہ مردم شناس بھی تھے۔ پرانی کتابوں کے تاجر کسی کتاب میں دلچسپی لینے والے گاہک سے زیادہ قیمت وصول کرتے ہیں مگر مولوی شمس الدین جس کتاب شناس کو کسی نادر کتاب پر فریفتہ پاتے تو اس کے ذوق کے پیش نظر بسا اوقات قیمت خرید سے بھی کم قیمت لے لیتے۔ ایسے کئی واقعات کو میں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اور اس درویش صفت کتب فروش کے انداز کتب فروشی پر داد و تحسین دیے بغیر نہ رہ سکا۔ میری موجودگی میں اسٹیٹ بنک کے سربراہ ممتاز حسن کسی کتاب کی تلاش میں آئے، مولانا کے پاس وہ نادر کتاب موجود تھی۔ پیش کی۔ چند صفحات کی کتاب تھی۔ ممتاز حسن مرحوم نے از رہ قدر افزائی بتایا کہ مولانا میں اس کتاب کی تلاش میں تیس سال سے سرگرداں تھا۔ انہوں نے ایک سو روپیہ کا نوٹ نکال کر پیش کیا۔ (ان دنوں سو روپے کا نوٹ، سو روپے کا قبالہ ہوتا تھا) مولانا شمس الدین اٹھے اور اپنی جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکالا جس پر ممتاز حسن کے دستخط چھپے ہوئے تھے اور کہا، آپ اس نوٹ کی سفیدی پر اپنے قلم سے ایک اور دستخط فرما دیجیے۔ دستخط ثبت ہوئے

تو مولانا نے فرمایا: ''یہ نادر (نوٹ) میری نادر کتاب کی قیمت ہے''۔ اور سو روپے کا نوٹ واپس کر دیا۔

مولوی شمس الدین مرحوم کی دکان پر ہر مکتب فکر کے کتاب شناس اور ''کتاب تلاش'' آیا کرتے تھے۔ سنی، وہابی، دیوبندی، شیعہ، سکالر، پروفیسر غرضیکہ اساتذہ و طلبہ کی مجلس رہتی۔ مولوی شمس الدین اپنی وضع داری اور مہمان نوازی کی عادت کی وجہ سے ساری زندگی غربت کی وادی میں سفر کرتے رہے۔ جنازہ اٹھا تو ایک ''غریب الدیار'' اور ''غریب الحال'' درویش ہمارے کندھوں پر تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی کے خلیفہ حضرت طاہر بندگی کے خصوصی احاطہ میانی لاہور میں آسودہ خاک ہوئے۔ ان کی قبر کے ساتھ محمد صدیق الماس رقم (صاحب القلم) آرام فرما ہیں جبکہ مولانا شمس الدین (صاحب الکتاب) تھے۔ میں ان کی آرام گاہ کے پاس سے گزرتا ہوں تو فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھ جاتے ہیں اور حضور نبی کریم ﷺ کی نعت کا شعر لبوں پر آ جاتا ہے۔

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب!

(''جہانِ رضا'' اگست، ستمبر ۱۹۹۴ء)

۱۔ اب یہ تاریخی حیثیت کا حامل نوٹ پروفیسر محمد اقبال مجددی کی ملکیت ہے۔ اس کا عکس محمد عالم مختار حق کی کتاب ''نذر شمس'' میں شریکِ اشاعت ہے۔

علماء کرام کی یادیں

صدرالا فاضل سید نعیم الدین مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ:

جن علمائے کرام نے فاضل بریلوی کے ساتھ مل کر برصغیر میں مقام مصطفیٰ کی پاسداری اور عشق مصطفیٰ ﷺ کی شمع کو مسلمانوں کے دلوں میں روشن کرنے کے لیے جدوجہد کی ان میں صدرالا فاضل سید محمد نعیم الدین مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کا نام سرفہرست ہے۔

میں نے ۱۹۳۹ء میں آپ کو مسجد وزیر خاں لاہور کے اسٹیج پر پہلی بار تقریر کرتے ہوئے سنا۔ آپ کا چہرہ درخشاں، قد بہت بلند اور لباس عالمانہ وجاہت کا آئینہ دار تھا۔ تقریر کے دوران حضور ﷺ کا نام نامی آتا تو آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں۔ ان کے بیان میں ایک خاص رنگ تھا۔ سامعین میں سے اکثر لوگ اپنے آقا و مولا کا نام سن کر بے اختیار روتے۔ یہ کیفیت میرے جیسے نوعمر طالب علم کے لیے حیران کن تھی کہ تقریر کرنے والا اور تقریر سننے والے اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو روک نہیں سکتے۔ ''صدرالا فاضل'' کی آواز میں سوز بھی تھا اور عالمانہ گرج بھی تھی۔ ان کی تقریر گھنٹوں جاری رہتی اور اہل درد اٹھنے کا نام نہ لیتے۔

آپ اعلیٰ حضرت کے نامور شاگرد جناب علی حسین اشرفی کچھوچھوی کے معروف خلفاء اور علماء اہلسنت کے ممتاز علماء کرام میں شمار ہوتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت بریلوی کے ترجمہ قرآن ''کنز الایمان'' پر آپ کا تفسیری حاشیہ بنام ''خزائن العرفان'' بڑا مشہور ہوا۔ برصغیر کی آبادی میں ''دوقومی نظریہ'' آل انڈیا سنی کانفرنس بنارس کا انعقاد اور مراد آباد میں ''جامعہ نعیمیہ'' کی بنیاد آپ کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ اسم گرامی محمد نعیم الدین، تخلص

نعیم، تاریخی نام غلام مصطفیٰ، لقب صدر الافاضل تھا۔ والد مکرم مولانا محمد معین الدین نزہت اپنے وقت کے مشہور عالم دین اور شاعر تھے۔ ۲۱ صفر المظفر ۱۳۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ قرآن پاک حفظ کیا، ''ملا حسن'' تک درس نظامی کی کتابیں مولانا شاہ فضل رسول سے پڑھیں۔ سید شاہ گل محمد قدس سرہ سے ۱۳۱۸ھ میں افتاء نویسی کی سند لی۔ طب مولانا شاہ فضل احمد امروہوی سے پڑھی۔ ۱۳۲۰ھ میں دستار بندی ہوئی۔ والد مکرم نے قطعہ تاریخ کیا:

ہے مرے پسر کو طلبہ پر وہ فضیلت
سیاروں میں رکھتا ہے مریخ فضیلت
نزہت نعیم الدین کو یہ کہہ کے سنا دے
دستار فضیلت کی ہے تاریخ ''فضیلت''
۱۳۲۰ھ

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے خلافت حاصل کی۔ متعدد مواقع پر آپ کے وکیل رہے۔ تدریس کا خاص انداز تھا۔ ''صدر الافاضل'' کا لقب اعلیٰ حضرت بریلوی نے ہی عطا کیا تھا۔ ایک وقت تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ''البلاغ اور الہلال'' میں آپ نے زوردار مضامین لکھے۔ آپ نے ۱۳۲۰ھ میں ''الکلمۃ العلیاء'' لکھی جو علمی اور نظریاتی دنیا میں بڑی مشہور ہوئی۔ سارے ہندوستان میں غیر مقلدین، دیوبندی علماء اور آریہ سماجیوں سے مناظرے کیے۔ منشی برکت رام پوری، سید حبیب ایڈیٹر ''سیاست'' لاہور کو لے کر مولوی خلیل احمد انبیٹھوی سے مناظرہ کرنے کے لیے ''مظاہر العلوم سہارنپور'' پہنچے اور علمائے دیوبند کو ساکت کر دیا۔ بڑے صائب الرائے، مدبر اور ملت کا درد رکھنے والے تھے۔ آپ کے نامور شاگردوں میں سے مولانا سید غلام جیلانی میرٹھی، حضرت مولانا محمد عمر نعیمی، مفتی محمد حسین نعیمی، بانی جامعہ نعیمیہ لاہور، استاذ العلماء ابوالبرکات سید احمد قادری مدظلہ العالی، مولانا غلام معین الدین نعیمی مدیر (سواد اعظم)

مولانا مفتی احمد یار خاں گجراتی، مولانا نور اللہ صاحب بصیر پوری، مولانا ابوالحسنات، الحاج پیر محمد کرم شاہ صاحب بھیروی آسمان شہرت پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔

آپ کی تصانیف میں تفسیر قرآن، اطیب البیان، الکلمۃ العلیاء، سوانح کربلا، کتاب العقائد، دیوان ریاض نعیم، خاص طور پر مشہور ہیں اور ہر ایک کے کئی کئی ایڈیشن چھپے۔ وفات ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۸ء، مطابق ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ کو ہوئی۔

۱۹۴۴ء کی ایک جگمگاتی رات کا سرور میرے دل و دماغ کو ابھی تک درخشاں کیے ہوئے ہے، جب میں نواب وزیر خاں لاہور کی مسجد کے صحن کے ایک کونے میں چند احباب کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہم حضرت سید محمد محدث کچھوچھوی کی سٹیج پر آمد کے منتظر تھے۔ مسجد کا صحن سامعین سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ انجمن مرکزی حزب الاحناف لاہور کا سالانہ جلسہ تھا اور آج حضرت محدث کی تقریر سننے کے لیے ہزاروں سامعین ہمہ تن گوش تھے۔

میرے پاس مسجد کے ایک گوشے میں ابوالنور مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں، مولانا غلام دین مرحوم (انجن شیڈ) مولانا غلام ربانی مرحوم (حافظ مظہر الدین کے بھائی) حافظ مظہر الدین مرحوم اور ان کے ایک دوست صوفی غلام حسین گوجروی بیٹھے تھے۔ میں عمر میں سب سے چھوٹا تھا اور علم میں ان سب کا خوشہ چین تھا۔ یہ ابھرتے ہوئے مقرر تھے جو تمام لوگوں کی نظر سے بچ کر مسجد کے ایک کونے میں بیٹھے تھے۔ حضرت محدث کے لیے انتظار کی گھڑیاں لمبی ہوئیں تو حافظ محمد مظہر الدین نے مجھے چھوٹا جان کر چار آنے دیئے اور فرمایا جاؤ وزیر خان کے چوک سے پکوڑے بیچنے والے سے چار آنے کی پکوڑیاں لے آؤ۔ (یہ پکوڑا فروش بے نظیر بھٹو صاحبہ علیہا ما علیہا کے منظور نظر وزیر جہانگیر بدر صاحب کے والد محترم تھے) گرم گرم پکوڑیاں آئیں تو انتظار کی شدت کم ہونے لگی۔ ادھر حضرت محدث کچھوچھوی نعروں کے درمیان علامہ ابوالبرکات اور دوسرے علماء اہل سنت کی جلو میں سٹیج پر جلوہ افروز ہوئے تو حافظ محمد مظہر الدین مرحوم گنگنائے:

کس کی زلفوں کی مہک لائی ہے طیبہ سے نسیم
دل و جاں وجد کناں جھک گئے بہرِ تعظیم

یہ شعر میرے دل میں اتر گیا اور آج تک قرار دل وجاں ہے۔

حافظ مظہر الدین رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۹۸۱-۵-۲۲):

مولانا حافظ محمد مظہر الدین مرحوم مشہور عالم دین مولانا نواب دین رمداسی کے بیٹے تھے اور چند سال پہلے سر پر دستار فضیلت سجا کر دار العلوم حزب الاحناف سے فارغ التحصیل ہوئے تھے اور وہ ایک ممتاز عالم دین، بلند پایہ خطیب اور گل بار قلم کے مالک بن کر دنیا کے سامنے آئے۔ وہ نوجوان خطیبوں کے ہمنوا تھے۔ تقریر کرتے تو لطف آجاتا، بات کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے۔ مجھے ان کی تقریروں سے دلچسپی کے ساتھ ساتھ دست بوسی کا بھی حصہ ملا۔ وہ جس سٹیج پر کھڑے ہوتے، سامعین جھوم جھوم جاتے۔ وہ اکثر اپنے والد محترم مولانا نواب الدین کے ساتھ مولانا نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسے میں آتے، قیام کرتے اور طلبہ کے ساتھ گفتگو کرتے۔ صوفی غلام حسین گوجروی مرحوم بھی اسی مدرسہ میں پڑھتے تھے۔ رمداس کے رہنے والے تھے۔ ہم وطن ہونے کی وجہ سے ان سے خصوصی لگاؤ تھا۔ مجھے بھی ان کی مجالس میں سے حصہ ملتا۔ پاکستان بنا تو حافظ محمد مظہر الدین یک دم گم ہو گئے۔ نہ خطاب نہ تقریر، نہ محراب نہ منبر، نہ آنا، نہ جانا۔ نہ نامہ نہ پیام!

ع جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

پاکستان کو بنے چند سال ہوئے تو راولپنڈی سے ایک روزنامہ ''کوہستان'' نکلا۔ ''کوہستان'' دیکھتے دیکھتے صحافتی دنیا پر چھا گیا۔ راولپنڈی کے علاوہ وہ لاہور سے بھی چھپنے لگا۔ ''کوہستان'' چھپنے کیا لگا، لوگوں کے دل و دماغ پر چھانے لگا۔ 'کوہستان' کے اداریہ کے صفحہ کے ساتھ ''نشان راہ'' کے عنوان سے روزانہ ایک کالم چھپتا۔ ''نشان راہ'' بڑا دل پسند کالم تھا۔ میں دلچسپی سے پڑھتا۔ لکھنے والے کے قلم کی چاشنی اور مضمون کی

حلاوت دل و جاں کو زندگی بخشتی۔ ''کوہستان'' کے چیف ایڈیٹر نسیم حجازی میرے شناسا تھے۔ ایک محفل میں ملاقات ہوئی تو میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا کہ ''نشان راہ'' کون لکھتا ہے۔ انہوں نے بتایا ''حافظ مظہر الدین''۔ دل جھوم گیا۔ دوسرے دن خط لکھا۔ ''نشان راہ'' کے مختلف موضوعات پر اظہار مسرت کیا اور اس طرح خط کتابت کا سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ میں نے محراب و منبر کو خیر باد کہنے کا شکوہ کیا تو فرمانے لگے:

ع زیں ''مرہان سست عناصر'' دلم گرفت!

ایک عرصہ تک ''نشان راہ'' لکھتے رہے۔ ''کوہستان'' روبزوال ہوا تو ''نشان راہ'' بھی بند ہو گیا۔ اب ان کی نعتوں کی خوشبوئیں پھیلنے لگیں۔ وہ مجھے نعت لکھ کر بھیجتے اور اپنے کلام کے امتیازات سے بھی آگاہ کرتے۔ ان کی تحریر کی حلاوت اور نعت کی مٹھاس ابھی تک میرے کانوں میں شہد بن کر ٹپکتی ہے۔

میں انہیں ''اسلام آباد'' ملنے ان کے گھر گیا۔ ان دنوں وہ نعت کی دنیا میں آباد تھے۔ میں نے مسجد وزیر خان میں سنا ہوا نعتیہ شعر یاد دلایا تو تڑپ اٹھے اور ساری نعت سنادی:

کس کی زلفوں کی مہک لائی ہے طیبہ سے نسیم
دل و جاں وجد کناں جھک گئے بہرِ تعظیم

میرے خواجہ کی عنایت کے مظاہر ہیں تمام
لب جاں بخش مسیحا، ید بیضائے کلیم

لبِ داؤد پہ نغمے تیری زیبائی کے
دل ایوب و براہیم میں تیری تکریم

خلد اک جلوۂ رنگین تیری رعنائی کا
موج دریائے کرم تیری ہے موج تسنیم

تیری رحمت نے گداؤں کو بنایا سلطان
تیری تدبیر نے کی نوع بشر کی تنظیم

ایک وقت تھا کہ بشیر حسین صاحب ناظم ہماری طرح ''فقرے'' تھے۔ آج وہ وزارت امورِ مذہبیہ اسلام آباد میں ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ہیں۔ سترہ بار حج کر چکے ہیں۔ ایم اے کی چار ڈگریاں در بغل لیے پھرتے ہیں۔ سربراہان مملکت پاکستان کے محبوب نظر رہے ہیں۔ جب ''فقرے'' تھے میری فرمائش پر آدھی رات کے وقت حافظ مظہر الدین مرحوم کی مندرجہ بالا نعت اپنی خاص آواز میں پڑھی۔ مجھے یاد ہے لوگ بستروں سے اٹھ کر گلیوں میں آ گئے۔ گلیوں میں گھومنے والے بازار میں جمع ہو گئے اور بازاروں میں جانے والے ناظم صاحب کے اردگرد حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ یہ حافظ صاحب کی نعت کا کمال تھا یا ناظم صاحب کے اندازِ نعت خوانی کا اثر تھا یا خواجہ بطحا کی محبت کی کشش تھی!!

ع دل وجاں وجد کناں جھک گئے بہر تعظیم

حافظ محمد مظہر الدین مرحوم کے نعتیہ کلام کے کئی حصے چھپے۔ کچھ زندگی میں، کچھ زندگی کے بعد۔ ان کے کلام میں ''مدینہ پاک'' کا ذکر سطر سطر پر لکھا ہوا ملتا ہے۔ شاہ مدینہ، اصحاب مدینہ، ارباب مدینہ، بہار مدینہ، بازار مدینہ، خاک مدینہ، غبار مدینہ، خار مدینہ، حتیٰ کہ ''سگان مدینہ'' کا ذکر جس والہیت سے کرتے ہیں، وہ ان کا ہی حصہ تھا۔

تیری مٹی وہیں کی ہے ''مظہر''
تجھ سے آتی ہے بو مدینے کی

نعت گوئی کے باغوں سے گزرتے ہوئے انہیں روحانیت کا ایسا گوشہ ملا، جہاں یادِ محبوب کے ساتھ شب بیداری، سحر خیزی اور قرب خداوندی کی کیاریاں آباد تھیں۔ ان کے اردگرد بے پناہ دنیا گھومنے لگی۔ حاجت مند دعاؤں کے لیے امنڈنے لگے۔ مرد، عورتیں خانقاہ کے اردگرد بیٹھے رہتے۔ میں ملاقات کو گیا۔ لوگ زیارت کو ترس

رہے تھے اور میں ملاقات کے لیے لپک رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو شفقت فرمائی۔ بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔ پوچھا کیا کھاؤ گے؟ عرض کی ''پکوڑیاں'' بے پناہ ہنسے! گلے لگا لیا اور بڑی دعائیں دیں۔ ان کی علمی اور روحانی یادگاریں ''تجلیات، نشان راہ، بانگ جبریل''، اہل محبت کو ان کی یادوں سے سرشار کر دیتی ہیں۔

آقا بیدار بخت مرحوم:

آقا بیدار بخت مرحوم عالم دین تو نہ تھے مگر ''السنۃ الشرقیہ'' کے ماہر استاد تھے۔ انہوں نے لاہور میں دہلی دروازے کے باہر حضرت شاہ محمد غوث کے دربار کے عقب میں کارپوریشن کے ایک سکول میں ''دارالعلوم السنۃ الشرقیہ'' کے نام سے ایک ایسا شبینہ ادارہ قائم کیا تھا، جس میں ملازمت پیشہ نوجوان منشی فاضل، ادیب فاضل اور مولوی فاضل کے امتحانات پاس کر کے بی اے کا امتحان دے کر علمی منازل طے کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب کوئی نوجوان سکول و کالج میں داخل ہوئے بغیر تعلیم حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ زبانوں کے امتحانات پاس کرنے کے بعد پرائیویٹ طور پر اعلیٰ امتحانات کے لیے مجھے ۱۹۴۴ء میں منشی فاضل کی تیاری کے لیے ''آقا بیدار بخت'' کے دارالعلوم میں داخلہ لینا پڑا تو میں نے اپنی درخواست پر ''آقائے بیدار بختاں و حامی زیردستاں'' لکھا تو میری فیس معاف کر دی گئی۔ برکت علی محمڈن ہال لاہور کے ایک جلسہ میں میں نے نظیری نیشاپوری کے ایک شعر کو موضوعِ سخن بنا کر تقریر کی۔

؎ چراغ زندہ می خواہی در شب زندہ داراں زن
کہ ''بیداری بخت'' از بخت بیداراں شود پیدا

آقا بیدار بخت مرحوم نے ارشاد فرمایا کہ آج سے ہفتے میں ایک دن تم میرے ساتھ چائے پیا کرو گے۔ ان دنوں دارالعلوم کے پرنسپل کے ساتھ چائے پینا بڑا اعزاز تھا۔

آقا بیدار بخت مرحوم کو فارسی زبان پر بڑا عبور حاصل تھا۔ وہ ''دیوان نظیری، دیوانِ حافظ، رباعیات ابوسعید ابوالخیر اور مثنوی مولانا روم'' پڑھاتے تو لطف آ جاتا۔ وہ خود

بھی جھوم جھوم کر پڑھاتے۔ یوں معلوم ہوتا کہ وہ ''حافظ اور رومی'' کی خانقاہ کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ آقا بیدار بخت تدریس میں انتھک معلم تھے۔ شام سے رات دس بجے تک پڑھاتے۔ علی الصباح دس بجے تک پڑھاتے۔ دن کو طالبات کو پڑھاتے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق آقا بیدار بخت نے ایسے بیس ہزار نوجوانوں کی علمی راہنمائی کی جو گریجویٹ بن کر اعلیٰ مراتب پر فائز ہوئے۔ لاہور میں علم کی اتنی وسیع پیمانے پر تدریس و تعلیم آقا مرحوم کے بغیر شاید ہی کسی دوسرے کے حصہ میں آئی ہو۔

آقا بیدار بخت کے رفقائے علم بھی بڑے محنتی اور قابل لوگ تھے۔ ان میں مخدوم غلام جیلانی صاحب، سید اصغر علی شاہ جعفری، ایم۔اے، محمد عاشق مرحوم، علامہ تاجور نجیب آبادی، محمد موسیٰ نظامی، احمد غریب نواز مرحوم، محمد ارشد کیانی، ایم۔اے، مفتی محمد عالم مرحوم (مفتی غلام سرور لاہوری، مئولف ''خزینۃ الاصفیاء'' کے نواسے) علامہ کیلانی اور دوسرے اساتذہ کے نام علمی دنیا میں درخشاں رہیں گے۔ آج روپے کی دوڑ نے ملک میں ''علم فروشوں'' کے اڈے قائم کر دیے ہیں مگر جب ہماری قوم غربت میں پھنسی ہوئی تھی تو یہ اساتذہ بے سروسامان شاگردوں کو علم کے موتیوں سے مالا مال کرا کرتے تھے۔

امتحانات قریب آتے تو طلبہ کی تعداد بڑھتی تو دارالعلوم کا دامن تنگ ہو جاتا۔ آقا بیدار بخت اور ان کے رفقاء اپنی کلاس یونیورسٹی ہال میں لگاتے اور پڑھنے والوں کی تعداد دو ہزار تک جا پہنچتی۔ آج ساٹھ لاکھ کی آبادی والا لاہور شادی ہال، تجارتی چوراہے تو بنتا جا رہا ہے مگر علم کے پیاسوں کو سنبھالنے والے ادارے اجڑتے جا رہے ہیں۔ دوسری طرف ''علم فروشی'' کی منڈیاں کھلتی جا رہی ہیں۔

آج پاکستان کے اعلیٰ دفاتر میں بیٹھے ہوئے ایسے سیکڑوں افسروں کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں، جو آقا بیدار بخت کے دسترخوان علم سے ٹکڑے اٹھا کر گریجویٹ بنے تھے۔ اور اعلیٰ مناصب پر پہنچے تھے۔ مجھے وہ ''یتیم'' آج بھی ملتے ہیں اور ایئر کنڈیشنڈ

دفتروں میں رہتے نظر آتے ہیں، جو آقا بیدار بخت کی خیرات پر جوان ہوئے تھے۔ میں اکثر ایسے قانون دانوں کا شناسا ہوں، جو دارالعلوم ''السنۃ الشرقیہ'' سے شام اعلیٰ علم کی دولت لے کر نکلے۔ مجھے عدلیہ میں ابھی تک وہ واقف کار دکھائی دیتے ہیں، جو آقا بیدار بخت کے کالج سے نکل کر گریجویٹ بنے۔ میں ایک کروڑ پتی صنعت کار سے آج بھی ملتا ہوں، جس کی فیس معاف کرانے کے لیے مجھے ''مولا بخش'' کے ہوٹل پر کئی بار جانا پڑا تھا۔ یہ یادیں ان حضرات کے لیے بھی باعث فخر ہوں گی مگر میں انہیں آقا بیدار بخت کی علمی فیاضی کی زندہ مثالیں خیال کرتا ہوں۔

''آقا بیدار بخت'' مرحوم نے اس زمانے میں علم کے چشمے رواں دواں رکھے، جب علم کے دروازے بند تھے۔ طالب علم غربت کے ہاتھوں تنگ تھے، طالب علموں کے والدین فیس ادا کرنے سے قاصر تھے۔ آج علم فروشی کے بیوپاری، آج علم سے محروم سیاست دان، آج جہالت کے اندھیروں میں بھٹکنے والے امراء، آج احساس علم سے نا آشنا، ''قومی راہنما'' قوم کے فرزندوں کو وہ کچھ نہیں دے سکتے، جو آقا بیدار بخت نے تن تنہا انہیں شبانہ روز محنت سے دیا تھا۔

''کہ بیداریِ بخت از بختِ بیداراں شود پیدا''

(''جہانِ رضا'' اکتوبر ۱۹۹۴ء)

علمائے کرام کی یادیں

علامہ عبدالنبی کوکب رحمۃ اللہ علیہ (م: ۸۷-۱-۱۹):

علامہ عبدالنبی مرحوم ایک ذہین، فطین اور ممتاز سنی عالم دین تھے۔ وہ گجرات میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو گجرات میں سنیوں کی ایک مشہور دینی درسگاہ طلبہ کی تربیت میں مصروف تھی۔ یہ دینی درسگاہ پیر ولایت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں کام کر رہی تھی۔ اس درسگاہ میں نامور سنی مدرس مصروف تدریس تھے۔ ان میں ایک ممتاز عالم دین مولانا مفتی احمد یار خاں صاحب نعیمی رحمۃ اللہ علیہ بھی مسند تدریس پر فائز تھے۔ یہ وہی مفتی احمد یار خان ہیں جنہوں نے آگے چل کر تفسیر نعیمی، نور العرفان، جاء الحق، مراۃ شرح مشکوٰۃ اور کئی دوسری بلند پایہ اعتقادی اور نظریاتی کتابیں لکھ کر بڑا نام پایا۔ علامہ عبدالنبی کوکب مرحوم نے اس درسگاہ سے اکتساب علم کیا۔ پھر انہیں اعلیٰ تعلیم کی پیاس لاہور لے آئی۔

لاہور آئے تو ان دنوں دارالعلوم ''جامعہ نعیمیہ'' دارالعلوم ''حزب الاحناف'' اور دوسرے کئی علمی چشمے طلبائے علم کو سیراب کر رہے تھے۔ علامہ کوکب نے ان درسگاہوں سے اکتساب علم بھی کیا اور ساتھ ساتھ کالج اور یونیورسٹی کے علمی مدارج کو بھی یکے بعد دیگرے طے کر لیا۔ وہ اپنی ذہانت اور شب و روز محنت سے ایک طرف علوم دینیہ سے فارغ ہوئے، دوسری طرف کئی مضامین میں ایم اے کر لیا۔ جب انہوں نے عربی میں ''ماسٹر آف آرٹ'' کی ڈگری حاصل کی تو وہ پنجاب بھر میں اول آئے۔

علامہ کوکب میرے ہم وطن ہونے کی وجہ سے میرے محبوب دوست تھے۔ وہ ہلکے پھلکے جسم میں علم و ذہانت کا ایک سمندر تھے۔ دیکھنے میں وہ ''طفل مکتب'' نظر آتے، مگر جب اہل علم کی مجلس میں بیٹھ کر گفتگو کرتے تو ان کی ذات سے علم و فضل کا

...ب کمل'' جاتا۔ وہ چند ہی سالوں کے اندر لاہور کی علمی محفلوں پر چھا گئے۔ علماء کرام کے محبوب نظر بن گئے اور طلبہ کے مطلوب استاد کی حیثیت سے ہر محفل کی جان نظر آنے لگے۔ انہوں نے چند سال پہلے جن درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی تھی، ان میں ایک ماہر استاد کی حیثیت سے مسند تدریس پر دکھائی دینے لگے۔ انہوں نے یونیورسٹی جوائن کیا تو اپنی قابلیت کی وجہ سے پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری کے ''شعبہ مخطوطات'' کے انچارج بن گئے۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد اورینٹل کالج، یونیورسٹی پنجاب میں لیکچرار لگے۔ مسجد تاجے شاہ، چیمبرلین روڈ، لاہور میں درس قرآن شروع کیا تو لاہور کے تشنگان علوم قرآن کا مجمع لگنے لگا۔ سید ابوالحسن الہجویری داتا گنج بخش لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی عظیم الشان مسجد میں مسند ارشاد بچھائی تو اہل دل پروانہ وار جمع ہونے لگے۔ دینی جلسوں میں خطاب کرتے تو ان کی تقریر اہل علم کو متاثر کرتی۔

انہوں نے اپنی شبانہ روز محنت سے پنجاب یونیورسٹی کی عظیم الشان لائبریری کو ایسا مربوط کیا کہ قلمی کتابوں کا شعبہ چمکنے لگا۔ وہ اہل علم کی قدر کرتے۔ اہل تحقیق کی رہنمائی کرتے اور تشنگان علوم و فنون کی تشنہ کامی کا سامان مہیا کرتے۔ میں جن دنوں ''تذکرہ علماء اہل سنت'' کو ترتیب دے رہا تھا تو ان کے قلمی شعبے سے مجھے بہت کچھ ملا۔ سید شرافت نوشاہی مرحوم (مئولف شریف التواریخ) نے آپ کی نگرانی میں ہی ''گنج شریف'' کے قلمی نسخے کو صاف کر کے ترتیب دیا تھا۔

وہ داتا دربار کی مسجد میں درس دیا کرتے۔ پڑھے لکھے لوگ خاصی تعداد میں آپ کا درس سنا کرتے تھے۔ ان کا انداز بڑا علمی اور تحقیقی ہوتا۔ ان دنوں محکمہ اوقاف کی سیٹ پر ایک بے دین سی۔ ایس پی آفیسر، مسعود بھگوان، کھدر پوش کی تقرری ہوگئی۔ وہ علماء کرام کے خلاف تھا۔ جب علماء کرام اس کے ملحدانہ نظریات کے خلاف بات کرتے تو وہ سیخ پا ہو جاتا۔ وہ محکمہ اوقاف کا خدا بنا بیٹھا تھا اور سمجھتا تھا کہ اوقاف کے تمام علماء اور مشائخ میرے تنخواہ دار ملازم ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس نے اپنے محلے بھاٹی دروازہ کے ایک حجام کو، جو دس سال کویت میں حجامتیں بناتا رہا اور بازاری عربی بولنے

میں مشاق تھا، اپنا ''مشیر اللسان عربیہ'' بنالیا۔اوقاف کا سربراہ جب کسی عالم دین کو اپنے دفتر میں بلاتا تو اس حجام کو حکم دیتا کہ اس عالم دین سے ''کویتی'' عربی میں بات کرو اور عالم دین سے کہتا کہ میرے حجام سے عربی میں بات کرو۔ جب وہ عالم دین عربی میں گفتگو نہ کرسکتا تو کہتا ''تم کیسے ''مولوی'' ہو جو میرے حجام سے بھی عربی نہیں بول سکتے ؟ جاؤ اور اردو میں نماز پڑھایا کرو اور اردو میں اذان دیا کرو''۔علماء کرام حیران تھے کہ یا اللہ! اس ملک عزیز پر یہ وقت بھی آنا تھا کہ کویت کے بھاگے ہوئے حجام ''مشیر اللسان عربیہ'' مقرر ہوں گے اور علماء کرام کی ''حجامتیں'' کرتے پھریں گے۔

؎ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

داتا دربار کی مسجد میں مولانا کوکب مرحوم کی علمی بساط ''کھدر پوش بھگوان'' کو پسند نہ تھی۔اس نے درس بند کرنے کا حکم دیا۔لوگوں نے احتجاج کیا مگر اب کھدر پوش بھگوان نے پولیس کی مدد سے علامہ کوکب کو مجبور کر دیا کہ وہ مسند ارشاد کو خالی کر کے ''کویت کے حجام'' کے حوالے کر دیں۔

اب علامہ کوکب تاجے شاہ کی مسجد میں درس دینے لگے تو لوگوں سے مسجد بھرنے لگی اور قرآن وحدیث کا یہ چشمہ جاری وساری رہا۔ان دنوں لاہور ڈویژن کے کمشنر مختار مسعود تھے۔انھوں نے اپنی نگرانی میں مینار پاکستان تعمیر کرایا۔مال روڈ پر ''مسجد شہداء'' بنوائی اور ''پنجاب پبلک لائبریری'' میں قرآنیات کا ایک شعبہ ''قرآن محل'' تیار کرایا۔اس شعبہ میں قرآن اور قرآن پر لکھی جانے والی تفاسیر اور کتابیں جمع ہونے لگیں۔مختار مسعود بڑا علم دوست، دانشور اور خوبصورت قلم کا مالک تھا۔اس کی کئی کتابیں سیاست وادب کا حسین امتزاج ہیں۔اس نے علامہ کوکب کی خدمات ''قرآن محل'' کے لیے مستعار لیں۔ مجھے یاد ہے علامہ مرحوم نے اس کام کو اتنی تندہی اور محنت سے نباہا کہ کمشنر عش عش کر اٹھا۔مولانا کوکب نے بڑی بلند پایہ نادر ونایاب تفاسیر خرید خرید کر ''قرآن محل'' کو مزین کیا اور ایسے ایسے موتی لا کر جمع کیے کہ اہل علم وفضل کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔لاہور کے ایک مفسر قرآن میرے استاد مکرم مولانا نبی بخش

حلوائی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ نے ''تفسیر نبوی'' پنجابی اشعار میں پندرہ جلدوں میں لکھی تھی۔ یہ ایک نہایت اہم اور بے مثال تفسیر تھی۔مولانا باغ علی نسیم صاحب نے مولانا نبی بخش حلوائی کے خلیفہ مجاز ہونے کی حیثیت سے، مولانا عبدالنبی کوکب کی فرمائش پر ''پنجابی تفسیر نبوی'' کا ایک مکمل سیٹ ''قرآن محل'' کو اعزازی طور پر پیش کیا تو کمشنر مختار مسعود بہت خوش ہوئے اور افتتاحی تقریر میں ''تفسیر نبوی'' کا خصوصی طور پر ذکر کرتے ہوئے مولانا کی علمی خدمات کو ہدیہ تحسین پیش کیا۔''قرآن محل'' میں علمی جواہر پارے جمع کرنا، انہیں سجانا مولانا کوکب مرحوم کی زندگی کا ایک سنہری کارنامہ ہے۔آج بھی میں ''قرآن محل'' دیکھنے جاتا ہوں تو مجھے ''قرآن محل'' کے در و دیوار سے علامہ کوکب مرحوم کی روح جھانکتے دکھائی دیتی ہے!

حکیم محمد موسیٰ امرتسری (م:۱۹۹۹-۱۱-۱۷):

آج سے تیس سال قبل حکیم محمد موسیٰ امرتسری، بانی مرکزی مجلس رضا، کو سنیوں کی زبوں حالی پر بڑی تشویش تھی۔ان کا خیال تھا کہ سنی جلسوں، جلوسوں، مجالس نعت اور عرسوں کو بڑی شان وشوکت سے مناتے ہیں اور ان پر لاکھوں روپیہ خرچ کرتے ہیں مگر تحریری میدان میں وہ بہت پیچھے ہیں۔ان کی کتابیں لوگوں تک نہیں پہنچتیں۔اگر کوئی کتاب چھپ کر آتی بھی ہے تو بڑی بے سروسامانی کی حالت میں، جسے پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔آپ کی تحریک پر دہلی دروازے کے باہر حضرت ''شاہ محمد غوث'' کے دربار کے ایک حجرے میں، جہاں مولانا سعید احمد نقشبندی، خطیب مسجد شاہ محمد غوث رہتے تھے۔پہلا اجلاس ہوا۔اس اجلاس میں ہم چند ممبران تھے مگر اس محفل میں علامہ کوکب میر محفل تھے اور سب کو آپ کی ذہانت اور قلم پر اعتماد اور ناز تھا۔ایک حلقہ ''دائرۃ المصنفین'' کے نام پر قائم کیا گیا۔فنڈ جمع ہوا اور عربی کتابوں کے ترجمے پر کام شروع ہوا۔یہ کام مولانا کوکب نے بڑی خوبی سے سرانجام دینا شروع کیا۔

حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری چشتی نے کچھ عرصہ بعد ''مرکزی مجلس رضا'' کی

بنیاد رکھی تو ابتدائی طور پر ''یوم رضا'' برکت علی محمڈن ہال، بیرون موچی دروازہ والا
منایا جاتا تھا۔ اس ''یوم رضا'' میں علامہ کوکب مرحوم صف اول میں ہوتے۔ چنانچہ
آپ نے ''مقالات یوم رضا'' تین سال تک ترتیب دیے، جو اہل علم میں بے حد پسند کیے
گئے۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے علمی اور روحانی مقالات کے واقف علماء کرام
علامہ عبدالنبی کوکب اور حکیم محمد موسیٰ امرتسری مدظلہ العالی کی ان کوششوں کو ہدیۂ تحسین پیش
کیا اور ملک کے گوشے گوشے سے دعاؤں کے لیے ہاتھ اٹھتے ہوئے آگے بڑھے۔

محمد ابراہیم علی چشتی مرحوم:

جن دنوں مجھے ''تذکرۂ علماء اہلسنّت'' مرتب کرنے کا شوق تھا، میں لاہور کے
ایک دانشور اور صاحب قلم وعلم مولانا ''محمد ابراہیم علی چشتی'' کی زیارت کو جا پہنچا۔ ان
کے ہاں ان دنوں علم وفضل کا دور چلتا اور مختلف موضوعات پر گفتگو کے دروازے کھلے۔
میں نے ''تذکرۂ علماء اہلسنّت، لاہور'' میں معاونت کی التجا کی تو بہت خوش ہوئے اور
بڑی خندہ پیشانی سے میری رہنمائی فرمائی۔ وہ قد وقامت کے لحاظ سے سرو قد اور توانا
جسم وجان کے مالک تھے۔ سفید چہرے پر سیاہ داڑھی بجتی تھی۔ بات میں زور تھا اور گفتگو
معلومات سے لبریز ہوتی۔ ان کے ہاتھ میں ان کے والد مکرم مولانا محرم علی چشتی صاحب
مرحوم کا ایک موٹا سا ڈنڈا ہوتا جو سارے لاہور میں ان کا امتیازی نشان تھا۔ بعض
اوقات سلسلۂ گفتگو دراز ہوتا تو مجھے فرماتے آؤ ذرا سیر کر آئیں۔ وہ اٹھتے، ''انارکلی''
سے نکل کر بھاٹی دروازے کے باغ سے ہوتے ہوئے ٹکسالی دروازے جا نکلتے اور وہاں
سے شاہی مسجد کے دامن میں اپنے پیرومرشد خواجہ صابر شاہ کے مزار پر جا پہنچتے۔ حاضری
دیتے، فاتحہ پڑھتے اور اس طرح سیر مکمل کر کے واپس آجاتے۔ وہ اپنی صحت اور عمر کے
لحاظ سے سیر کو ضروری سمجھتے تھے مگر میں اپنی صحت اور عمر کے لحاظ سے سیر کو سفر سمجھتا تھا۔
کئی بار ایسا ہوا کہ میں بھاٹی دروازے پہنچ کر چشتی صاحب کی ''رفاقت سیر'' سے کنارہ کشی
کرنے لگتا تو فرماتے کہ ''سیر نہیں کرو گے'' میں نماز کا بہانہ بنا کر یہ کہہ کر جدا ہو جاتا ''الصلوٰۃ

خیر من السیر'' وہ شاہی مسجد چلے جاتے۔ میں داتا صاحب کی مسجد میں آجاتا۔
محمد ابراہیم علی چشتی مرحوم لاہور کے اسی ''خانوادۂ چشتیہ'' کی آخری یادگار تھے جو
اپنے علمی اور سیاسی اثر ورسوخ کی وجہ سے لاہور پر ایک عرصہ تک چھایا رہا۔ آپ کے
والد مولانا محرم علی چشتی اپنے وقت کے نامور وکیل، صحافی، قانون داں اور سیاسی شخصیت
ہونے کی وجہ سے لاہور کے ''بادشاہ گر'' تھے۔ آپ کے دادا مولانا احمد بخش یکدل اردو،
عربی اور فارسی کے قادر الکلام عالم اور شاعر تھے۔ آپ کے تایا نور احمد چشتی مؤلف
''تحقیقات چشتی'' ایک مورخ اور محقق تھے۔ آپ کے نانا خواجہ مستان شاہ کابلی اپنے وقت
کے ''قطب زماں'' تھے اور افغانستان کے بادشاہ امیر عبدالرحمٰن کے پیرومرشد تھے۔
آپ نے بی-اے، ایل-ایل-بی، پھر ایم-اے صحافت کیا تو عملی زندگی میں
قدم رکھا۔ تحریک پاکستان کے ابتدائی دنوں میں آپ نے آزادی وطن میں عملی حصہ
لینے کے ساتھ ''خلافت پاکستان'' کا نظریہ پیش کیا۔ پاکستان کی جدوجہد کے دوران
صوبہ سرحد میں اگرچہ مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی مگر کانگریس کا غلبہ تھا۔ اس صوبہ
میں خان عبدالغفار خاں ''سرحدی گاندھی'' کی حیثیت سے پاکستان کی مخالفت کر رہے
تھے۔ پھر ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے۔ خان عبدالغفار
خان نے ''خدائی خدمت گار'' کے نام پر ایک ''سرخ پوش'' فوج تیار کر لی تھی جو تحریک
پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش تھی۔ ان دونوں قبائلی علاقوں اور افغانستان کے
مشرقی پہاڑی علاقوں میں ایک جنگجو لیڈر ''پیر آف ایپی'' کا بڑا چرچا تھا۔ ''پیر آف
ایپی'' کئی سالوں سے انگریزوں کے خلاف جہاد میں مصروف تھا اور انگریزوں کو ''پیر
آف ایپی'' کے نشانہ بازوں کی وجہ سے قبائلی علاقہ میں پہنچنے میں بڑی دشواری تھی۔
انگریز کے کئی فوجی افسر ''پیر آف ایپی'' کے مجاہدین کے ہاتھوں قتل ہوئے مگر ''پیر آف
ایپی'' نے اس علاقہ میں انگریزوں کو آگے نہ بڑھنے دیا۔ آزادی کی تحریک چلی۔ اب
انگریزوں کو تو اس علاقے سے دلچسپی نہ تھی مگر خان عبدالغفار خان نے ''پیر آف ایپی''

کو اپنا ہم نوا بنالیا۔ تحریک پاکستان کے خلاف بیان دلوانے شروع کر دیے۔ یہ بات پاکستان مسلم لیگیوں کے لیے بڑی تشویش ناک تھی۔

ان حالات میں ''پیر آف اپی'' کے مقابلہ میں ایک جنگجو روحانی پیشوا ''بابا بلند کوہی'' قبائل میں نمودار ہوئے، جو تحریک پاکستان کے حق میں اور مسلم لیگ کی حمایت میں بیان جاری کرتے تھے۔ یہ بیانات ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' لاہور میں چھپنے لگے۔ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے نامہ نگار میاں محمد شفیع (م-ش-مرحوم) ''قبائلی علاقے کی پہاڑیوں'' میں چلے جاتے اور ''بابا بلند کوہی'' سے انٹرویو لے کر چھاپتے۔ تصویریں چھپتیں، مقالات چھپتے اور تحریک پاکستان کے حق میں تفصیلی مضامین لکھے جاتے۔ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کی اس مہم سے قبائل اور صوبہ سرحد میں تحریک پاکستان کے حق میں زمین خاصی ہموار ہوگئی اور ''پیر آف اپی'' نے بھی سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ حمید نظامی مرحوم کا ''نوائے وقت'' ابھی نیا نیا تھا مگر حمید نظامی مرحوم میاں محمد شفیع (م ش) کو ''بابا بلند کوہی'' کے بیانات چھاپنے پر ہدیۂ تحسین پیش کرتے۔ ۱۹۶۸ء میں ایک مشہور صحافی ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے یہ انکشاف کیا کہ ''بابا بلند کوہی'' قبائلی علاقہ میں کوئی ''بابا'' نہیں تھا۔ یہ دراصل محمد ابراہیم علی چشتی مرحوم تھے، جو ''پیسہ اخبار'' سٹریٹ لاہور میں اپنے گھر بیٹھ کر ''بابا بلند کوہی'' بن کر بیان دیتے اور مقالات سپرد قلم کرتے جسے م-ش-مرحوم ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' میں چھپوا دیا کرتے تھے۔

محمد ابراہیم علی چشتی مرحوم بڑے راسخ العقیدہ سنی دانشور اور صحافی تھے۔ میں ایوبی دور میں اکثر ان کے ساتھ سنیوں کے جلسوں میں جاتا۔ پھر مذہبی اور سیاسی ہنگاموں میں شرکت کرتا جو لاہور کے کوچہ و بازار کی رونق ہوتے تھے۔ ان کا حافظہ بڑا قوی تھا۔ یادداشت بڑی مضبوط تھی۔ انہیں دنیا بھر کی آزادی کی تحریکوں کی تاریخ یاد تھی۔ وہ مجھے عالمی سطح کے مشاہیر پر آگاہی بہم پہنچاتے۔

لاہور میں چار نوجوانوں کا عہد:

یہ روایت عام انداز میں مشہور ہے مگر تمام راوی ثقہ ہیں کہ لاہور میں انگریزی عہد کے چار نوجوانوں نے عہد کیا تھا کہ جب تک ملک کو آزادی دلوا کر اس میں ''نظام خلافت'' قائم نہ ہوگا، وہ شادی نہیں کریں گے۔ ان میں ایک میاں محمد شفیع (م ش) تھے۔ دوسرے حکیم محمد انور بابری مرحوم تھے۔ تیسرے محمد ابراہیم علی چشتی مرحوم تھے۔ چوتھے مجاہد اہل سنت، مولانا عبدالستار خان نیازی تھے۔ میاں محمد شفیع اور انور بابری نے تو عہد توڑ دیا اور شادیاں کرلیں مگر ابراہیم علی چشتی اور مولانا عبدالستار خان نیازی اپنے عہد پر قائم رہے۔ جب ان دونوں شادی زدہ نوجوانوں سے ایک بے تکلف دوست نے اس ''عہد شکنی'' کا سبب پوچھا تو جواب دیا:

بگفت ایں جا پری رویاں نغزاند
جو گل بسیار شد ''پیلاں'' بلغزند

ابراہیم علی چشتی، انگریزی کے زود نویس ادیب تھے۔ انہوں نے ہر ہٹلر کی خود نوشت کا اردو ترجمہ کیا۔ ''ملفوظات بابا بلند کوہی'' لکھے۔ ''خلافت پاکستان'' لکھی۔ پاکستان کے لیے ''جدید اسلامی دستور'' انگریزی میں ترتیب دیا۔ ان کے اکثر انگریزی مضامین برطانیہ، جرمنی اور امریکہ کے بلند پایہ اخبارات اور رسالوں میں چھپتے تھے۔ وہ اعلیٰ حضرت امام اہلسنّت مولانا احمد رضا خان بریلوی کے سخت معتقد تھے۔ ان کے سامنے ''فتاویٰ رضویہ'' کی ابتدائی جلدیں آئیں تو انہیں بے حد مسرت ہوئی۔

حکیم محمد موسیٰ امرتسری چشتی نظامی نے ''مرکزی مجلسِ رضا'' کی بنیاد رکھی اور اعلیٰ حضرت پر تعارفی مقالات اور فاضل بریلوی کی اصل کتابیں چھپوا کر تقسیم کرنے لگے تو محمد ابراہیم علی چشتی کو بے پناہ مسرت ہوئی۔ وہ حکیم صاحب کی خدمات کو سراہتے، مجلس کے دفتر میں جاتے۔ حکیم صاحب کو اپنے گھر بلا کر اعزاز و اکرام سے نوازتے اور اپنے علمی مشوروں اور تجربوں سے آگاہ کرتے۔ حکیم صاحب نے بھی ان کی خدمات کو

ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا اور ان کی علمی اور اعتقادی کاوشوں کو سراہا۔

ان کی دلی خواہش تھی کہ ''فتاویٰ رضویہ'' کا انگریزی ترجمہ کر کے مغربی ممالک کے مفکرین اور معتقدین تک پہنچائیں مگر زندگی نے وفا نہ کی اور وہ ۱۹۶۸ء میں راہی ملک بقا ہو گئے۔

بد از عاشقان ''بزرگان چشت''
خداوند جائش کند در بہشت

(''جہانِ رضا'' نومبر ۱۹۹۴ء)

لاہور کے خطیبوں کی رونقیں

پاکستان بنا تو اس نظریاتی مملکت کی تشکیل میں علمائے کرام نے ایسی خدمات سرانجام دیں جو سنہری حروف سے لکھی جانے کے قابل ہیں۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے لاکھوں مسلمان ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ ان میں دانشور، سکالرز، سخنور اور علماء و خطباء کی ایک نمایاں تعداد تھی۔ جو پاکستان کے مختلف شہروں اور قصبوں میں جا بسے تھے، شیعہ، وہابی، دیوبندی اور دوسرے فرقوں کے علماء کے علاوہ، علمائے اہلسنّت کی ایک خاصی تعداد پاکستان میں آبسی۔ ان سنی علماء میں بڑے بڑے جلیل القدر اور بلند پایہ اہلِ علم و فضل تھے۔ ان میں مدرس بھی تھے، معلّم بھی، مفتی بھی تھے اور فقیہ بھی مگر خوش بیاں خطباء اور مقررین کا جو طبقہ آیا۔ انہوں نے پاکستان کے گوشے گوشے کو روشنیاں بخشیں۔ کراچی، حیدر آباد اور سکھر میں بڑے شعلہ بیان سنی خطیب آ بسے۔ صرف پنجاب میں نظر ڈالیں تو مولانا احمد سعید شاہ کاظمی (ملتان) مولانا عارف اللہ شاہ قادری (راولپنڈی) قاری احمد حسن فیروزپوری (گجرات) شیخ الحدیث مولانا سردار احمد (فیصل آباد) مفتی ظفر علی نعمانی (سانگلہ ہل) مولانا محمد حسین صاحب نعیمی (لاہور) مولانا غلام علی اشرفی (اوکاڑہ) مفتی اعجاز ولی خان بریلوی (لاہور) حافظ محمد مظہر الدین رمداسی (راولپنڈی) کے علاوہ بہت سے ایسے خطیب نظر آتے ہیں جن سے خیاباں سنّیت میں بہار آ گئی۔ ان مہاجر علماء کے علاوہ مقامی سنی علماء میں بڑے بلند پایہ خطیب تھے۔ جو آسمانِ خطابت پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکتے رہے۔ (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین)

مقامی خطباء میں سے علامہ سید ابوالبرکات (مرکزی انجمن حزب الاحناف لاہور) علامہ سید ابوالحسنات (مسجد وزیر خان لاہور) ابوالنور مولانا محمد بشیر (کوٹلی لوہاراں)

مولانا غلام الدین (انجن شیڈ لاہور) مولانا محمد بخش مسلم، بی اے (لاہور) مولانا محمد یوسف (سیالکوٹ) مولانا محمد عمر اچھروی (لاہور) صاحبزادہ سید فیض الحسن آلو مہاروی (گوجرانوالہ) شیخ القرآن عبدالغفور ہزاروی (وزیر آباد) پیر سید ولایت شاہ (گجرات) مولانا سید حامد علی شاہ (سرگودھا) سید محمود شاہ (گجرات) مفتی احمد یار خاں نعیمی (گجرات) مولانا محمد شریف نوری (قصور) پیر سید امانت علی شاہ (لاہور) (رحمہم اللہ) اور ان کے رفقائے خطابت پنجاب میں چھائے ہوئے تھے۔ لاہور میں علامہ سید ابوالبرکات اور علامہ ابوالحسنات (مولانا سید دیدار علی شاہ الوری کے نامور فرزند) اپنی خطابت کی وجہ سے بڑے معتبر تھے۔ علامہ ابوالبرکات تدریس اور مناظرہ میں اپنے وقت کے امام تھے۔ علامہ ابوالحسنات، خطابت کے ساتھ ساتھ سیاسی میدان میں بھی بڑے قد آور رہنما تھے انہوں نے تحریکِ پاکستان کے بعد آزادیٔ کشمیر کی جدوجہد میں بھرپور کردار ادا کیا تھا۔ ''تحریکِ ختمِ نبوت'' میں علمائے کرام کے اس قافلے کے سردار تھے۔ جس نے حکومت وقت اور اقتداری قوتوں سے ٹکر لی تھی۔

مولانا محمد بخش مسلم بی-اے (م:۸۷-۲-۱۷):

مولانا محمد بخش مسلم، بی-اے لوہاری دروازے کے باہر ''مسلم مسجد'' کے باغ میں تحریکِ پاکستان پر بڑے بھرپور لیکچر دیا کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد انہوں نے اپنی خوش بیانی سے عوام و خواص کو متاثر کیا۔ وہ اردو انگریزی میں یکساں تقریر کرتے۔ دیہات میں جاتے تو ٹھیٹ پنجابی میں ایسا خطاب کرتے کہ عوام کے دلوں میں اتر جاتا۔ انہوں نے اپنے طرزِ بیاں سے نوجوانوں کو بڑا متاثر کیا تھا۔

مناظرِ اسلام مولانا محمد عمر اچھروی رحمۃ اللہ علیہ (م:۷۱-۱۲-۲۱):

مولانا محمد عمر اچھروی رحمۃ اللہ علیہ ایک مناظر کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ ان کے سامنے شیعہ، وہابی اور دیوبندی مناظرہ باز آتے تو خفت اٹھا کر بھاگ جاتے۔ ٹھیٹ پنجابی میں تقریر کرتے تو دلوں کو موہ لیتے۔ دورانِ تقریر اپنے خاص انداز میں

قرآن پڑھتے تو سامعین جھوم جھوم جاتے۔ ابھی پاکستان میں ایسے لوگ ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ جو اپنے ضروری کاموں کے لیے گھر سے نکلے اور مولانا اچھروی کی زبان سے قرآن سن کر اپنے ضروری کام بھول گئے۔ وہ دورانِ تقریر مناظرانہ نکتے بیان کرتے تو سامعین عش عش کر اٹھتے۔ وہ جب تک ''جامع مسجد داتا گنج بخش'' لاہور میں اعزازی خطیب رہے تو لوگ دوسرے شہروں سے کشاں کشاں چلے آتے اور ان کی تقریر سنتے۔

مولانا محمد شریف نوری رحمۃ اللہ علیہ (م:۷۲-۵-۱۳):

مولانا محمد شریف نوری بڑے خوش آواز خطیب تھے۔ قصور شہر چھوڑ کر آئے تو میو ہسپتال کے ساتھ ایک کھلی مسجد میں خطباتِ جمعہ کا آغاز کیا اور زندہ دلانِ لاہور کو کھینچ لیا۔ ان کی تقریر سننے کے لیے لوگ دور دور سے آتے اور دیر تک ان کی خوش بیانی سے حصہ پاتے۔ مولانا غلام دین مرحوم پنجابی کے ایک خوش گفتار خطیب تھے۔ خطابت کا آغاز کیا تو ریلوے انجن شیڈ کے ایک کھلے میدان میں کھڑے ہو کر تقریر کرنے لگے۔ یہ میدان آہستہ آہستہ سامعین سے بھرتا گیا۔ وہ اسلام کے حسن و جمال کو اس خوبی سے بیان کرتے ''کہ قافلے راہ بھول جایا کرتے تھے''۔ وہ جس میدان میں کھڑے ہوتے تھے آج وہاں ایک شاندار مسجد ان کی یاد کو تازہ کر رہی ہے اور اس کے محراب و منبر ان کی خطیبانہ یادوں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

مولانا غلام محمد ترنم رحمۃ اللہ علیہ (م:۵۹-۷-۲۴):

مولانا غلام محمد ترنم، امرتسر سے لاہور آئے تو ''مائی لاڈو'' کی مسجد میں آغازِ خطابت کیا۔ ان کی زور بیانی نے مسجد کے بام و در کو سمیٹ لیا۔ سامعین کی تعداد بڑھتی گئی۔ مسجد کا دامن تنگ ہوتا دکھائی دیا۔ تو ''پنجاب سول سیکرٹریٹ'' کے اندر ایک چھوٹی سی مسجد میں خطاب شروع کیا۔ ''سول سکریٹریٹ'' اِن دنوں لاٹ صاحب کا دفتر تھا۔ مگر مولانا ترنم کی تقریر نے لاٹ صاحب کے دفتر کے دروازوں کو عوام کے لیے کھول دیا۔ سارا لاہور آپ کی تقریر کو بلا دھڑک سننے کے لیے امڈ آتا اور یہ چھوٹی سی

مسجد پھیلتے پھیلتے ایک بڑی جامع مسجد بن گئی۔ مولانا غلام محمد ترنم ایک قادر الکلام مقرر تھے وہ اسلامی جنگوں اور مجاہدین کے کارناموں کے مناظر سامنے لاتے تو یوں معلوم ہوتا کہ ہم خود میدانِ جنگ میں کھڑے ہیں۔

جن دنوں کی یادوں سے ہم لاہور کے خطیبوں اور مقرروں کا تذکرہ کر رہے ہیں ان دنوں پیرزادہ اقبال احمد فاروقی (راقم الحروف) دہلی دروازے کے باہر کوتوالی کے ساتھ ایک مسجد میں تقریر کیا کرتا تھا۔ مسجد چھوٹی تھی۔ سامنے میدان کھلا تھا۔ اگر اپنی تعریف خود کی جائے تو "مقولہ شاعر بزبانِ شاعر" والی بات ہوگی مگر یہ امر واقعہ ہے کہ اہلِ ذوق اپنی مسجدیں چھوڑ کر اس مسجد میں آتے اور گھنٹوں تقریر سنتے۔

باز گلبانگ پریشاں می زنم   آتشے در عندلیباں می زنم

اسی زمانہ میں مولانا شمیم شاہ مرحوم فیض باغ اور مولانا سلیم اللہ مرحوم "سفید مسجد مصری شاہ" میں پنجابی میں تقریریں کیا کرتے تھے اور علم و فضل سے اپنے سامعین کی جھولیاں بھرتے جاتے آج یہ مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ خطیب نہ رہے۔ نمازی نہ رہے۔ مگر ایک وقت تھا کہ یہ مسجدیں آباد تھیں۔ دار الارشاد تھیں۔

مفتی محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ (م:۹۸-۳-۱۲):

مفتی محمد حسین نعیمی صاحب چوک دالگراں میں "مسجد دالگراں" میں تقریر کرتے تھے۔ یہ مفتی صاحب کے زور کا زمانہ تھا۔ جوش کا ز،نہ تھا۔ خطاب کا زمانہ تھا۔ اور تقریر کا زمانہ تھا۔ مفتی صاحب تقریر کرتے تو سننے والے مسجد کے صحن، چھت پھر بازار اور چوک میں پھیلتے جاتے۔ حق کی بات کرتے تو اقتدار کے چہرے پر سلوٹیں آ جاتیں۔ سیاست کی بات کرتے تو گورنر ہاؤس تک آواز چلی جاتی۔ میں نے انہیں اسی مسجد سے گرفتار ہوتے بھی دیکھا اور قید ہوتے بھی دیکھا اور سربلند ہوتے بھی دیکھا۔

کسی کو دشت نوردی کسی کو دار و رسن
یہ عظمتیں ہیں مقدر کسی کسی کیلئے

علامہ علاء الدین صدیقی رحمۃ اللہ علیہ (م:۷۷-۱۲-۲۷):

"پنجاب ہائی کورٹ" کی دیواروں کے ساتھ مسجد شاہ چراغ (جہاں آج ایوان اوقاف ہے) میں علامہ علاء الدین صدیقی مرحوم تقریر کیا کرتے تھے۔ وہ بڑے نستعلیق انداز میں تقریر کرتے۔ "تحریکِ پاکستان" میں انہوں نے بڑے علمی انداز میں حصہ لیا اور پرجوش انداز میں تقریریں کیں۔ مسجد شاہ چراغ میں ان کی تقریریں نہ تھیں بلکہ لیکچرز تھے۔ انہیں جج اور وکلاء حضرات بڑے احترام سے سنتے۔ صدیقی صاحب کا اندازِ بیان بڑا موزوں اور محتاط ہوتا۔ قانون داں طبقہ ان کے علمی انداز کو پسند کرتا تھا۔ وہ اپنے مخصوص اسلوب میں بڑے سلیقے سے تقریر کرتے۔ ان کے دم قدم سے "مسجد شاہ چراغ" آباد رہی، تابندہ رہی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان خدمات کا یہ صلہ دیا کہ وہ ترقی کرتے کرتے پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بن گئے۔

سید امانت علی شاہ نظامی:

انہی دنوں مغلپورہ گنج میں ایک عالمِ دین سید امانت علی شاہ چشتی نظامی مرحوم نے اپنے طرزِ بیان سے لاہور والوں کو متاثر کیا۔ وہ "مثنوی مولانا روم" پڑھتے اور تقریر میں فلسفہ "وحدۃ الوجود" پر گفتگو کرتے۔ آواز میں سوز تھا۔ رومی کا کلام ہوتا اور تصوف کے اسرار و رموز پر بات ہوتی۔ تو لوگ جوق در جوق آتے۔ مسجد بھر جاتی پھر ارد گرد کی گلیاں آباد ہو جاتیں۔

مولوی محمد عمر مرحوم:

شاہی قلعہ لاہور کے دامن میں "بیگم شاہی مسجد" میں ایک صوفی منش عالم دین، مولوی محمد عمر مرحوم بزرگوں کے واقعات اور کرامات کیا بیان کرتے تھے اس مسجد کو کبھی مولانا غلام قادر بھیروی رحمۃ اللہ علیہ نے زندہ کیا تھا۔ مولوی محمد عمر صوفیہ اور بزرگانِ دین کے محبت بھرے واقعات بیان کرتے۔ آواز میں گرج اور چمک تو نہ تھی۔ مگر سوز تھا جو

سنتا۔ان کی تقریر سنتا ہی چلا جاتا۔اٹھ کر نہ جاتا اور بار بار آتا۔

آج ہم نے لاہور کے ان سنی خطیبوں اور مقرروں کا مختصر سا تذکرہ کیا ہے۔ جن سے کبھی لاہور کی مساجد کے محراب و منبر آباد تھے۔ جن کی گفتار سے اہلِ لاہور کے دل دھڑکتے تھے۔ لیکن اگر ہم لاہور کی ان مساجد کا ذکر بھی کر دیں جہاں علمائے اہلسنّت کے علاوہ دوسرے مکاتب فکر کے خطیب اپنے سامعین کی ذہنی تربیت میں مصروف تھے تو یہ بھی ہماری یادوں کا ایک حصہ ہوگا۔

غیر سنّی علماء کے خطابات:

پاکستان بنا تو لاہور میں وہابی اور شیعہ مساجد کے خطیب تو نمایاں تھے۔ مگر دیو بندی علماء دبے دبے اور چھپے چھپے تھے۔ نہ ان کی مساجد نہ مدارس۔ ایک تو یہ لوگ ''تحریک پاکستان'' کے خلاف کام کرتے رہے تھے اور کانگریس کے ساتھ مل کر پاکستان کے خلاف تقریریں کرتے رہے تھے اور اس طرح یہ ''نیشنلسٹ علماء'' کہلاتے تھے۔ پاکستان بن گیا تو یہ ''بیچارے'' منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ کونے کھدروں میں بڑی دھیمی آواز میں تقریر کرتے۔ کچھ شرمندہ بھی تھے۔ کچھ لوگوں کے جذبات سے ڈرتے تھے، لاہور میں ان کا کوئی نمایاں مرکز خطابت نہیں تھا۔ مولوی احمد علی لاہوری اندرون شیرانوالے دروازے کی مسجد کے خطیب تھے اور بڑے پرزور دیو بندی خطیب تھے۔ بڑے جاندار مولوی تھے۔ تقریر کرتے۔ خطابت کرتے، درس دیتے، کتابیں لکھتے، مرید بناتے، تدریس کرتے، پمفلٹ چھپاتے، انہیں تقسیم کرتے اور دیو بندی نظریات کی بڑی بھرپور ترجمانی کرتے۔ لاہور میں ان کے دم قدم سے ''دیو بندیت'' قائم دائم تھی۔ یہ تحریک پاکستان کے حامی بھی تھے اور ترجمان بھی۔ انہوں نے مولوی اشرف علی تھانوی، مولوی شبیر احمد عثمانی، مولوی محمد حسن امرتسری کے انداز میں پاکستان کی حمایت کی۔ اور اپنی محنت و پامردی سے دیو بندیوں کا مرکز بنے رہے۔ وہ اگرچہ خود تحریک پاکستان کے ہمنوا تھے۔ مگر پاکستان کے مخالف ہندوستانی دیو بندی علماء ان کی پناہ میں

رہتے تھے۔ پاکستان بنا تو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اپنے ہندو کانگریسی دوستوں کے مخبروں سے ڈر کر مولوی احمد علی لاہوری کے ہاں پناہ گزین ہوئے تھے۔ مولوی احمد علی لاہوری بڑے زوردار مقرر تھے۔ وہ ان تھک خطیب تھے۔ ان کے بیان میں روانی تھی۔ ان کے بیان میں دلائل ہوتے وہ اپنے سامعین کو اپنے علم کا وافر حصہ دیتے تھے۔ وہ اتوار کے ساتھ درس قرآن دیتے۔ ان کے حلقہ درس قرآن میں اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ بیٹھتے!

امرتسر سے مولوی محمد حسن صاحب لاہور آئے تو نیلے گنبد میں ''جامعہ اشرفیہ'' قائم کیا۔ وہ مولوی اشرف علی تھانوی کے خلیفہ تھے۔ انہوں نے خطابت میں تو نام پیدا کیا مگر تدریس و تعلیم میں بڑی پامردی سے حصہ لیا۔ انہوں نے دن رات ''جامعہ اشرفیہ'' کی ترقی کے لیے کام کیا اور اسے بلندیوں پر پہنچا دیا۔ آج فیروز پور روڈ لاہور پر ''جامعہ اشرفیہ'' لاہور میں دیو بندی مکتب فکر کا بہت بڑا دار العلوم ہے۔

احراری خطیب:

لاہور میں احراری خطیبوں نے پاکستان بننے کے بعد اپنی تقریروں سے شہرت خاص حاصل کی تھی یہ لوگ تحریک پاکستان کے خلاف تھے۔ یہ کانگریس کی زر بخشی کی لپیٹ میں آ گئے تھے اور پاکستان کے خلاف کام کرتے رہے۔ پاکستان بن گیا۔ تو ان لوگوں کی پناہ گاہ یہی ملک تھا۔ لاہور میں ان کے نامور خطیبوں نے چند سالوں کی خاموشی (شرمندگی) کے بعد اپنے خطیبانہ جوہر دکھانے شروع کیے۔ ان لوگوں میں اگرچہ بعض علماء کرام تھے۔ مگر ان کی سیاسی تربیت اچھی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ لاہور میں کسی مسجد کو اپنا مرکز نہ بنا سکے۔ وہ عام جلسوں میں تقریریں کرتے اور جلسے لوٹتے تھے۔ وہ تقریروں کے بادشاہ تھے۔ ان کا ہر مقرر شعلہ بار تھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ساری ساری رات تقریر کرتے تو مجمع پر چھائے رہتے۔ وہ اس قدر قادر الکلام تھے کہ کسی کو اٹھنے نہ دیتے۔ ہلنے نہ دیتے، جانے نہ دیتے، ہنساتے رلاتے اور تڑپاتے۔ خوش آواز

تھے۔ خوش بیان تھے۔ ان کے تربیت یافتہ مقررین اور ان کے حاشیہ نشین خطیبوں میں صاحبزادہ سید فیض الحسن آلو مہاروی، چوہدری افضل حق، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، شیخ حُسام الدین امرتسری، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولوی محمد علی جالندھری، مولوی مظہر علی اظہر اور آغا شورش کاشمیری جیسے شعلہ بیاں مقرر وقت کے بہترین مقرر مانے جاتے تھے۔ احراری مقرروں کے علاوہ پاکستان بننے کے بعد ''جماعت اسلامی'' نے لاہور میں تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ جماعت اسلامی کے علماء میں پرجوش خطیبانہ انداز تو نہ تھا۔ مگر وہ لیکچرانہ انداز میں مسلسل اور روانی سے گفتگو کرتے۔ اپنے سامعین کی ذہنی تربیت کرتے۔ ہم ان کو ''ابجدی'' مقرر کہا کرتے تھے۔ مولانا مودودی نے اپنے خطابات اور مقالات سے بڑا کام لیا۔ مگر وہ بھی ''ابجدی خطیب'' کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ان کی زبان اور قلم نے یکساں کام کیا۔ وہ بذاتِ خود لاہور کی سُنی مساجد سے ہٹ کر بعض ویران مساجد یا پارکوں میں اجتماع کرتے اور مسلسل تقریریں کرتے۔ ان کی تقریروں میں تسلسل ہوتا اور دلائل ہوتے۔ اگرچہ ''جماعت اسلامی'' عوامی خطیب تو پیدا نہ کر سکی اور یہی وجہ ہے کہ جماعت اسلامی آج تک عوامی قیادت پر قبضہ نہیں کر سکی۔ مگر اس نے ڈاکٹر اسرار، نعیم صدیقی، کوثر نیازی اور چودھری طفیل محمد جیسے اچھے مقرر پیدا کیے۔

لاہور کی فضا میں وہابی (اہلِ حدیث) خطیبوں نے اپنی مساجد کو آباد رکھا۔ اپنے سامعین کو اپنے عقائد و نظریات سے وابستہ رکھا۔ مولوی عبداللہ روپڑی (مسجد قدس) بعد میں مولوی عبدالقادر روپڑی، مولوی عبدالواحد جامع مسجد چینیاں والے کے بعد مولوی احسان الٰہی ظہیر، خطیب جامع مسجد مبارک جیسے نامور وہابی لاہور کی وہابی دنیا کی رہنمائی کرتے رہے۔ پاکستان کے قیام کے کچھ عرصہ بعد لاہور میں بعض دیوبندی مقررین نے اپنے نام اور مقامات پیدا کیے۔ مولوی احمد علی لاہوری اور ان کے جانشین خطاب و تحریر میں اپنی روایت مضبوط نہ رکھ سکے۔ البتہ مولوی اجمل خاں نے قلعہ گوجر

سنگھ لابیٹ روڈ پر اپنے پُر زور خطاب سے دیوبندیوں کو مربوط رکھا۔

دیوبندی مولانا محمد اجمل خاں صاحب کی پامردی اور خوش بیانی سے ان کی مسجد کو مرکزی حیثیت ملی۔ جامعہ مدنیہ کے بانی حامد میاں دیوبندی مکتب فکر کے ایک جاندار خطیب اور معلم کی حیثیت سے لاہور میں ڈٹے رہے پہلے ''مسلم مسجد'' بعد میں ''جامعہ مدنیہ'' سے ان کے علمی اثرات دور دور تک پھیلے۔ لاہور کے دیوبندی خطابت، تقاریر میں تو دوسرے شہروں کے دیوبندی خطیبوں کے ہم پلہ نہیں تھے۔ مگر انتظامی امور میں انہوں نے اپنی مساجد کو بڑا مربوط کیا اور درس و تدریس میں قدم جماتے گئے۔

شیعہ حضرات خطاب و تذکار میں بڑے بلند بانگ ہیں۔ ان کی خطابی فصاحت و بلاغت کا اعتراف ان کے مخالف بھی کرتے ہیں۔ لاہور میں ان کے نامور خطیبوں اور ذاکروں میں حافظ کفایت حسین، علامہ شمسی، زیدی، نجفی مولوی اسمٰعیل بڑے نام آور خطیب بن کر ابھرے۔ مگر چونکہ شیعہ حضرات کی ماتمی مجالس اور محافل امام باڑوں (اب امام بارگاہوں) تک محدود تھیں وہ عوامی سطح پر خطاب نہ کر سکے۔ انہوں نے اپنی مساجد کی طرف بہت کم توجہ دی مگر امام باڑوں کو مربوط کیا۔ اس طرح وہ آج تک لاہور کی عوامی فضا کو شیعیت کے عقائد سے متاثر نہ کر سکے۔ البتہ پنجاب کے دور دراز دیہات کے ان پڑھ لوگ ان کی ماتمی مجلسوں میں شرکت کر کے اپنے عقائد سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔

لاہور شہر میں ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب علماء اہلسنّت نے شہر کے باغات میں تقاریر کا ایک اجتماعی سلسلہ شروع کیا۔ ہزاروں لوگ ان خطیبوں کی تقاریر سننے کے لیے جمع ہوتے۔ پنجاب بھر کے نامور اور بلند پایہ علماء لاہور تشریف لاتے اور لاہور کے باغات میں تقریریں کرتے۔ یہ سلسلہ اتنا مؤثر اور مفید تھا کہ ہر مکتب فکر کا آدمی بلا تردد ان کی مجالس میں شرکت کرتا۔ اور اپنا دامن علم و فضل کے ثمرات سے بھر کر گھر آتا۔

(''جہانِ رضا'' اپریل ۱۹۹۵ء)

ایک نورانی محفل کا تذکرہ

یہ ۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے جب علماء کرام اپنی تقریروں سے لاہور کے در و دیوار کو زر درخشاں رکھتے تھے۔ تحریک پاکستان کی ہوائیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ دوسری عالمگیر جنگ کٹ رہی تھی۔ برصغیر پر انگریز کے اقتدار کا آخری دور تھا۔ اور وہ اس جنگ میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ ملک میں جہاں سیاسی راہنما اپنی آزادی کے لیے جدو جہد کر رہے تھے وہاں علمائے کرام بھی آزادی کے بعد ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے کوشاں تھے۔ ''مجلس احرار'' کے شعلہ بار مقررین تو کانگریس کے جھنڈے تلے کھڑے ہو کر ''حکومت الٰہیہ'' قائم کرنے کا فلسفہ پیش کر رہے تھے۔ اسی طرح ''جمعیت علمائے ہند'' کے وہابی اور دیو بندی علماء کانگریس کے وظیفہ خوار حلیف تھے۔ یہ لوگ آزادی تو چاہتے تھے مگر ان کی وطن کی آزادی کے نعرے میں گاندھی اور نہرو کی ہمنوائی تھی۔ ان نیشنلسٹ علماء کرام کی تقریریں کانگریس کے سیاسی فلسفے کا عربی ترجمہ تھا۔

علمائے اہلسنّت اور مشائخ کرام ''مسلم لیگ'' کی رفاقت میں ایسے پاکستان کا مطالبہ کر رہے تھے جس کا مطلب ''لا الٰہ الا اللّٰہ'' تھا۔ ہم لوگ ان دنوں سیاسی جلسوں سے ہٹ کر ان نورانی محفلوں میں بھی حصہ لیا کرتے تھے جہاں سے ہمیں محبوب خدا حبیب کبریا محمد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے تذکار و نعت کی غذا ملتی تھی۔ ان دنوں لاہور میں مختلف مقامات پر ایسی مجالس کا اہتمام ہوا کرتا تھا جہاں ملک کے خوش آواز نعت خوان بارگاہ رسالت میں ہدیہ نعت پیش کیا کرتے تھے۔ آج ہم ایک ایسی ہی نورانی محفل کا ذکر کر رہے ہیں۔

لاہور کے دہلی دروازے کے اندر ہر ماہ چاند کی چودہ تاریخ کو ایک ایسی ''مجلس

نعت'' منعقد ہوتی تھی جس کا اہتمام ''بابا نور'' اپنے مکان کی چھت پر کیا کرتے تھے۔ ''بابا نور'' محکمہ ریلوے میں ملازم تھے۔ مگر نعت خوانی پر بڑا روپیہ خرچ کیا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ وہ اس نورانی مجلس کے انعقاد کا اہتمام جس حسن وخوبی سے کرتے تھے اس کی مثال سارے لاہور میں نہیں ملتی تھی۔ اگر مجھے اجازت ہو تو میں کہوں گا کہ مجھے ساری زندگی میں ایسی بے مثال محفل نعت میں شرکت کا آج تک موقع نہیں ملا۔

''بابا نور'' مجلس نعت کے لیے جو میدان منتخب کرتے اس کے در و دیوار کو سفید براق قلعی سے سفید کرا دیتے تھے۔ فرش پر سفید براق چادریں بچھاتے۔ ''مجلس نعت'' میں شریک ہونے والے خراماں خراماں تشریف لاتے اور حلقہ بنا کر مجلس میں آ کر بیٹھتے جاتے اگر کوئی ننگے سر مجلس میں آتا تو ''بابا نور'' کے کارندے اس کے سر پر سفید ٹوپی پہنا دیتے۔

جب مجلس جمتی تو چودھویں کے چاند کی چاندنی ساری مجلس پر اپنا نور بکھیرتی۔ نعت خوان بڑے نورانی لباس میں جلوہ فرما ہوتے۔ ان کے سامنے مراد آباد کی سفید سجی ہوئی چھوٹی چھوٹی طشتریوں میں سفید مصری کی ڈلیاں اور سفید الائچیاں رکھی جاتیں۔ یہ سفید طشتریاں نعت خوانوں کے علاوہ سامعین کے سامنے بھی گھومتی رہتیں۔ ''بابا نور'' خود اٹھتے اور موتیے کے سفید ہاروں کی لڑیاں اٹھا کر ساری محفل میں گھومتے اور اپنے مہمانوں کے گلے میں ڈالتے جاتے۔ ''بابا نور'' خود ہی مہتمم مجلس ہوتے، خود ہی میزبان اور خود ہی ''میر مجلس'' ہوتے۔ ایک گھنٹہ بھر ''ختم غوثیہ'' کا ورد ہوتا۔ تمام اہل مجلس اس ''ختم غوثیہ'' کے کلمات بلند آواز میں، آواز سے آواز ملا کر ادا کرتے۔ ''ختم غوثیہ'' کے اختتام پر مجلس نعت شروع ہوتی تو خود ''بابا نور'' اور ان کے کارندے سفید چمکتی عطر دانیوں سے عطر گلاب اور کیوڑے کی ہلکی ہلکی پھوار سے ساری محفل کو مہکا دیتے۔ ''صلوٰۃ وسلام'' کی بارش کی پھوار کے ساتھ نعت رسول کا آغاز ہوتا تو نعت خوانوں کی مترنم آواز گونجتی۔

لب نور، دہن نور، ذقن نور، بدن نور
سر تا بقدم ہے سرِ سلطانِ زمن نور

دندان ولب و زلف، رخِ شاہ کے فدائی
ہیں درِ عدن، لعلِ یمن، مشکِ ختن نور

تابع رخِ شاہ کے مظاہر ہیں یہ سب نور
لو بن گئے ہیں اب تو حسینوں کے دہن نور

کیا بات ''رضا'' اس چمنستان کرم کی
زہرا ہے کلی جس میں حسین اور حسن نور

میرے دل و دماغ میں ساٹھ سال گزرنے کے باوجود ابھی تک وہ سرور موجود ہے جب اس مجلس میں ایک خوبصورت خوش گلو بچے نے یہ نعت پڑھی۔

میں بلبل باغ مدینے دی ہاں، کی کرناں باغ بہاراں نوں
میں وچھڑی احمد پیارے دی ہاں، اگ لاواں ان گلزاراں نوں

یہ ساری نعت سادہ مگر دل میں اترتی جاتی۔ سبحان اللہ! ماشاء اللہ! مرحبا! جزاک اللہ! کے الفاظ سے داد وتحسین کی بارش ہوتی۔ دل ڈھل جاتے۔ دماغ مہک اٹھتے اور جسم کا رواں رواں رقت سے جھوم جھوم جاتا۔

ان دنوں لاہور کی مجالس نعت میں میاں سرفراز عرف ''پپا'' کا طوطی بولتا تھا۔ اس کی باری آتی تو وہ نعت کا آغاز یوں کرتا۔

ہر جا کہ رسیدیم، سرکوئے تو دیدیم!

وہ اس انداز سے یہ فارسی نعت پڑھتا کہ لوگ جھوم جھوم جاتے۔ ایک ایک شعر کو کئی کئی بار پڑھتا اور مجلس کو لوٹ لیتا۔ اپنے سامعین کو تڑپاتا اور لوٹاتا جاتا اور نبی پاک کی نعت سناتا جاتا۔

کبھی کبھی امرتسر سے چل کر ایک نعت خواں ''جان محمد'' بھی آتا۔ جان محمد ان دنوں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا۔ آواز اونچی، سریلی مگر لے بڑی لمبی ہوتی۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی نعت پڑھتا تو لطف آجاتا۔

چمک تجھ سے پاتے ہیں سب پانے والے
میرا دل بھی چمکا دے، چمکانے والے

برستا نہیں دیکھ کر ابرِ رحمت
بدوں پر بھی برسا دے، برسانے والے

مدینے کے خطے، خدا تجھ کو رکھے
غریبوں، فقیروں کے ٹھہرانے والے

حرم کی زمیں اور قدم رکھ کے چلنا؟
ارے سر کا موقع ہے، او جانے والے!

رہے گا یونہی ان کا چرچا رہے گا
پڑے خاک ہو جائیں، جل جانے والے

جان محمد کی لے اتنی لمبی اور آواز اتنی بلند ہوتی کہ چاند کو جا چھوتی۔ اور واقعی ایسے دل سے آواز آتی کہ

چمک تجھ سے پاتے ہیں سب پانے والے!

کبھی کبھی اندرون موچی دروازہ لاہور کا رہنے والا ایک بلند آواز نعت خواں ''بودی شاہ'' بھی ''بابے نور'' کی نوری مجلس میں آجاتا۔ ''بودی شاہ'' ریلوے میں ملازم تھا۔ ''بابے نور'' کی رفاقت نبھانے کے لیے آجاتا۔ اس کی آواز کیا تھی، آواز اٹھاتا تو در و دیوار اس کی بلند آواز کے سامنے لرزنے لگتے۔ وہ گلا کھولتا تو یوں محسوس ہوتا کہ

آواز کا طوفان آ گیا ہے۔ سبحان اللہ! اللہ اس نعت خوان کو عالم برزخ میں بلند مقام دے۔ اس کی نعت خوانی سے دلوں کے زنگ مٹ جاتے۔ "وجلت قلوبھم" کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ ہوائیں اور فضائیں گواہی دیتیں کہ یہاں نعت رسول کی [illegible] باریاں ہو رہی تھیں۔

ان دنوں صوفی غلام حسین گوجروی مرحوم جو بعد میں پاکستان کے ایک زبردست خطیب کی حیثیت سے متعارف ہوئے، دہلی دروازے کے باہر جامع مسجد سُنّی کو قوالی میں پڑھتے تھے۔ وہ اس وقت صرف نعت خوان تھے۔ وہ ''بابے نور'' کی مجلس میں ''راقب قصوری'' کی کہی ہوئی پنجابی نعتیں سنایا کرتے تھے اور مجلس میں ایک سماں باندھ دیتے۔ مجلس نعت کے اختتام پر قیام وسلام کا دور چلتا۔ ان دنوں ابھی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی کے کہے ہوئے سلام ''مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام'' کے پڑھنے کا رواج نہیں تھا۔ ''بابا نور'' خود ''یا نبی سلام علیک!'' پڑھتا اور اہل مجلس کو اپنا ہم نوا بنا لیتا۔ وہ پورا ایک گھنٹہ سلام پڑھاتا اور پڑھاتے پڑھاتے تھکا دیتا۔ جب وہ آخری دعائیہ شعر

اے خدا کے لاڈلے، پیارے رسول
یہ سلام عاجزانہ ہو قبول!

پڑھتا تو ہم لوگ مجلس میں دوبارہ بیٹھ جاتے۔ ہم تھکے ہوتے مگر ''بابے نور'' کے کارندے چاروں طرف سے چمکتی ہوئی سفید عطر دانیوں کو پکڑے، ہاتھ ہلاتے، اہل محفل پر عطر اور کیوڑہ کی بارش کرتے تو ہماری تھکاوٹ چند لمحوں میں دور ہو جاتی۔ اب اختتامی ختم شریف کے بعد دعا ہوتی اور مہمانوں کے سامنے مختلف اقسام کی چیزیں لائی جاتیں، جس سے کام ودہن کو تسکین ہوتی۔

''بابے نور'' کی اس محفل میں کھانے پینے والی چیزوں میں بھی سفید ''نورانی'' چیزوں کا اہتمام ہوتا۔ ''بابا نور'' مہمانوں کے لیے جو چائے پیش کرتے اس میں سفید دودھ زیادہ ہوتا اور کشمیری چائے کا رنگ واجبی۔ پیالیاں سفید چینی سے بنی ہوتیں اور

ان کے ساتھ ''ختائیاں'' آتیں جو خصوصی طور پر سفید رنگ کی تیار کرائی جاتیں۔ پانی والے کے لیے مراد آباد کے چمکتے ہوئے سفید گلاس اور جگ مجلس کی زینت ہوتے۔ بتاشے، سفید مکھانے، سفید ریوڑیاں، سفید پلیٹوں میں پیش کیے جاتے۔ ''بابے نور'' کی ایسی ''نورٌ علیٰ نور'' نعتیہ مجالس میں تبرک بٹنے لگتا تو اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے اشعار یاد آتے:

صبح طیبہ میں ہوئی بٹتا ہے باڑا نور کا
صدقہ لینے نور کا آیا ہے تارا نور کا

تیرے ہی ماتھے رہا اے جان سہرا نور کا
بخت جاگا نور کا، چمکا ستارا نور کا

میں گدا، تو بادشاہ، بھر دے پیالہ نور کا
نور دن دونا تیرا، دے ڈال صدقہ نور کا

تیرے آگے خاک پر جھکتا ہے ماتھا نور کا
نور نے پایا تیرے سجدے سے سیما نور کا

جو گدا دیکھو لیے جاتا ہے توڑا نور کا
نور کی سرکار ہے، کیا اس میں توڑا نور کا؟

بھیک لے سرکار سے، لا جلد کاسہ نور کا
ماہ نو طیبہ میں بٹتا ہے مہینہ نور کا

انجمن والے ہیں انجم، بزم حلقہ نور کا
چاند پر تاروں کے جھرمٹ سے ہے ہالہ نور کا

آج ہم زندگی کی بے پناہ آسانیوں اور سہولتوں سے مالا مال ہیں اور ''محافلِ نعت'' اور ''مجالس میلاد پاک'' کے اہتمام میں بڑا خرچ کرتے ہیں مگر جو سلیقہ اور اہتمام ''بابِ نور'' کی مجالس میں دیکھا وہ نہ آج ''الحمراء'' لاہور کے ہال میں نظر آتا ہے، نہ اسلام آباد کے ''ہالیڈے ان'' میں دکھائی دیتا ہے۔

(''جہانِ رضا'' اگست ۱۹۹۵ء)

علماءِ کرام کی یادیں

پاکستان میں خوشحالی کے دور دورے سے ہماری معاشرتی اور معاشی اقدار بدل گئی ہیں۔ ہماری بود و باش سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک غریب ملک کے غریب شہری بھی ماشاء اللہ اپنے شب و روز میں امارت کی جھلکیاں زندگی کے دامن میں سمیٹ کر آگے جا رہے ہیں۔ اس معاشرتی تبدیلی میں ہمارے بعض علماء کرام نے بھی ''حجروں'' کو خیر باد کہہ کر کوٹھیوں میں رہنا شروع کر دیا ہے۔ پیدل چلنے کی عادت کو چھوڑ کر ایئر کنڈیشنڈ کاروں پر سفر کرتے ہیں۔ ''زکوۃ کی تملیک'' اور ''صدقہ کی تحلیل'' نے کئی مفلوک الحال علماء کو زندگی کی نعمتوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ ان میں سے اکثر ہمارے ہم درس، ہم سبق، ہم سفر، ہم پیالہ و ہم نوالہ ہی نہیں بلکہ فقر و فاقہ میں شریک زندگی رہے ہیں۔ آج ہم ان ''علمائے کرام'' کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ان قناعت پسند علمائے کرام کی یادوں میں اتنی بلندی دکھائی دیتی ہے کہ آسمانوں کی بلندیاں ان کے اخلاق و قناعت کی رفعتوں کے سامنے پست نظر آتی ہیں جو ہمارے ماضی کا سرمایہ تھے۔

ان علمائے کرام میں سے اگرچہ ایسے علمائے کرام خصوصاً واعظانِ اہل سنت بھی تھے، جنہیں قارئین ''جہان رضا'' کا ایک طبقہ ذاتی طور پر جانتا ہے۔ ہم نے ان علمائے کرام کو ''فاقہ زدہ'' یا ''غربت و مسکنت کا شکار'' تو نہیں دیکھا مگر ان کی شان قناعت و استغناء دیکھ کر ان کے نام پر سر و جان تعظیماً جھک جاتے ہیں اور حوصلہ بلند ہوتا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اللہ و رسول کی راہوں میں زندگیاں گزار دیں۔ مگر صبر و قناعت کا دامن کبھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ جنہوں نے دینی تبلیغ کے لیے دور دراز کے سفر کیے مگر اپنی خودی کو پامال نہیں ہونے دیا۔

مولانا محمد بخش مسلم-بی اے (م:۱۹۸۷-۲-۱۷):

انگریز کا زمانہ تھا۔ سفر میں بے پناہ مشکلات تھیں۔ ریاست ''بہاول پور'' کے بے لق ودق ریگستان پنجاب کے جفاکش آبادکاروں کی محنت سے سرسبز وشاداب ہو رہے تھے۔ ان آبادکاروں کی دلی تمنا ہوتی کہ وہ اپنے علاقے میں ان باکمال خطیبوں کی آوازسنیں، جن کی خوش بیانی سے لاہور کے درودیوار معمور ہو رہے تھے۔ ہارون آباد سے چودہ میل دور ایک جلسہ عام ہونا قرار پایا۔ مجھے حکم ہوا کہ میں لاہور سے مولانا محمد بخش مسلم-بی اے کو لے کر جلسہ گاہ میں پہنچوں۔ مولانا مسلم مرحوم کا ان دنوں خطابت میں طوطی بولتا تھا۔ وہ اردو، پنجابی اور انگریزی میں یکساں تقریر کرتے۔ جب وہ اپنی تقریر میں فرفر انگریزی کے جملے بولتے تو سامعین ایک نیا لطف حاصل کرتے تھے۔ مولانا مسلم لاہور سے روانہ ہوئے تو انہوں نے ایک زبردست پنجابی شاعر ''عشق لہر'' (م ۱۹۴۸-۱۱-۲۵) کو بھی اپنا ہم سفر بنالیا۔ ''عشق لہر'' صرف پنجابی شاعر ہی نہ تھے، قومی شاعر بھی تھے۔ وہ تحریک پاکستان کے دوران سارے پنجاب کے دیہات میں مسلم لیگ کی ہم نوائی میں پاکستان کے حق میں نظمیں سناتے رہے تھے۔ ہارون آباد جانے کے لیے صرف ایک راستہ تھا۔ پہلے ریل گاڑی پر سوار ہو کر قصور، پھر ''فیروز پور'' وہاں سے گاڑی تبدیل کر کے ''بہاول نگر'' اور وہاں سے گاڑی بدل کر ''ہارون آباد'' کا رخ کرتے۔ اس طرح ہمارا قافلہ پورے بیس گھنٹوں میں لاہور سے ہارون آباد پہنچا۔ گاڑی لیٹ ہونے کی وجہ سے ایک بس جو ہارون آباد سے چشتیاں کے ریتلے صحرا کو چیرتی ہوئی جاتی تھی، ہمارے جانے سے پہلے نکل چکی تھی۔ اب ہم تھے اور چودہ میل کا سفر تھا اور سامنے ریت کے پھیلے ہوئے ٹیلے تھے اور میں نے بے بسی کے عالم میں ان نازک شہری مہمان علماء کے چہروں پر نگاہ ڈالی تو نظریں جھک گئیں۔ مولانا مسلم مرحوم نے للکار کر کہا ''قدم بڑھاؤ ساتھیو! یہ چودہ میل پر جلسہ گاہ ہے!''

ہم چل پڑے۔ ریت کے ٹیلے ہمارے علماء کرام کے پاؤں کے نیچے ریشم وکمخاب

...بچھے جا رہے تھے۔ وہ نازک قدم جو لاہور کے باغوں میں چلتے بھی شرماتے تھے، ...کو روندتے ہوئے سفر پر رواں دواں تھے۔ رات کے سائے گہرے ہوتے جا رہے ...ہم جلسہ گاہ کے قریب پہنچے تو عشاء کی اذانیں بلند ہو رہی تھیں۔ ہمارے آنے کی خبر ...ہماری راہ میں انتظار کی آنکھیں بچھانے والوں کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے۔

...علمائے اہل سنت سے سٹیج درخشاں تھے۔ حد نگاہ تک سامعین کا مجمع پھیلا ہوا تھا۔ ''عشق لہر'' نے اپنی پنجابی نظموں سے مجمع میں ''لہر بہر'' کردی۔ مولانا مسلم مرحوم اٹھے ...اپنی خوش آوازی اور روانی سے دلوں کو گرماتے گئے۔ میں دوسرے علماء کرام کی ...تقریروں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ مگر مولانا مسلم مرحوم نے اہل محبت کو خوش کر ...دوسرے دن آرام کیا۔ تیسرے دن لاری پر بٹھانے کے لیے پچاس آدمی آئے ...منتظمین نے مولانا مسلم مرحوم کے کان میں کہا ''اللہ حافظ جزاک اللہ!''

ان بزرگوں کو اتنے لمبے سفر کی تکلیف اور پھر شاندار تقریروں کے باوجود لوگوں ...نے صرف ''جزاک اللہ'' پر ٹال دیا تھا۔ میرے دل میں ملال تھا مگر راستے میں ''مولانا مسلم'' مرحوم اور ''عشق لہر'' نے خوش ہو کر کہا ''الحمد للہ ہمیں بہت کچھ مل گیا ہے۔ ہم نے اس صحرا میں اپنے رسول کا پیغام پہنچا کر ہزاروں دلوں کو زندہ کر دیا ہے۔ کیا یہ ''صلہ'' کسی چیز سے کم ہے!''

مولانا غلام محمد ترنم (م:۵۹-۷-۲۴):

بڑے قادر الکلام مقرر تھے۔ جب تقریر کرتے، مجمع پر چھا جاتے۔ امرتسر سے آئے تو لاہور کے اہل ذوق کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ لوگوں کو مخاطب کرتے تو کسی کو ہلنے کا یارانہ ہوتا۔ تقریر کیا ہوتی، ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا امنڈتا سنائی دیتا۔ ''شاہدرہ ٹاؤن'' والوں نے ایک رات جلسہ پر بلالیا۔ رات ایک بجے رخصت کیا تو ہر ایک میزبان اس ...سے ہاتھ چوم چوم کر الوداع کہتا جاتا کہ شاید دوسرے نے خدمت کر دی ہے۔ مولانا ترنم کے پاس واپسی کے لیے تانگے کا کرایہ بھی نہیں تھا۔ ان دنوں رات کو شاہدرہ سے تانگے لاہور کو آنا گوارا بھی نہ کرتے تھے۔ مولانا تن تنہا پیدل روانہ ہوئے۔ دریائے

راوی کے پل پر کسی واقف کار نے دیکھا کہ ترنم صاحب اپنا ایک چپل ہاتھ میں اٹھائے جس کا تسمہ ٹوٹ گیا تھا، پیدل چلے آ رہے ہیں۔ واقف کار نے کہا ''حضرت یہ کیا؟'' فرمایا: ''چپ رہو! مسلمانوں کا پادری ''مولوی'' ہوں۔ اگر عیسائیوں کو پتا چل گیا کہ مسلمانوں کا پادری یوں گھر آتا ہے تو آئندہ میری تقریر کوئی نہیں سنے گا۔ آج ہی میری تقریریں سن کر پندرہ عیسائی میرے ہاتھ پر مسلمان ہوئے ہیں''۔

خطیب پاکستان مولانا غلام دین، انجن شیڈ لاہور:

آپ بڑے خوش آواز اور خوش بیان خطیب تھے۔ تقریر کرتے تو سامعین جم جاتے۔ بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے، دل دھڑکنے لگتے اور جس درد سے واقعات سناتے، دل کرتا سناتے جائیں۔ آپ انجن شیڈ کی مسجد کے سامنے کھلے میدان میں تقریر کرتے تو دور دور تک لوگ ہمہ تن گوش نظر آتے۔ ریلوے کے چند کارکن ''شاد باغ لاہور'' میں جو ان دنوں شہر کے شمالی کنارے پر واقع تھا، رہتے تھے۔ از رہ محبت و عقیدت مولانا کو شاد باغ تقریر کے لیے لے گئے۔ رات کا وقت مصری شاہ، وسن پورہ، تاج پورہ حتیٰ کہ لاہور شہر کے لوگ جوق در جوق جلسہ گاہ میں پہنچے۔ بڑا بھرپور مجمع تھا۔ مولانا نے تین گھنٹے تقریر کی۔ مجال ہے کوئی اٹھ کر جائے۔ جلسہ ختم ہوا۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ جلسہ گاہ خالی ہوگئی۔ میں نے دیکھا حضرت مولانا غلام دین مرحوم تن تنہا مسجد میں بیٹھے ہیں اور چاروں طرف دیکھ رہے ہیں۔ میں حاضر ہوا اور پانی پیش کرنے کی اجازت طلب کی۔ فرمانے لگے: ''میرے میزبان شربت لا رہے ہوں گے''۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا کوئی میزبان ادھر آیا نہ شربت لایا۔ مولانا نے مسجد کی ٹونٹیوں سے پانی پیا۔ میں نے پوچھا اس رات گئے سواری تو کوئی نہیں۔ آپ کی واپسی کا کیا انتظام ہے؟ فرمانے لگے: ''فلاں صاحب سواری کا انتظام کرنے گئے ہوں گے''۔ آدھ گھنٹہ مزید گزر گیا مگر نہ کوئی سواری آئی نہ ''فلاں صاحب'' لوٹے۔ میں نے ان لوگوں کے گھروں کے دروازے کھٹکھٹائے۔ ہر شخص دوسرے کا نام لے کر اندر جا کر سو جاتا۔ صورت حال سے مولانا کو آگاہ کیا اور ساتھ ہی عرض کیا میرا گھر قریب ہے۔ آج رات میرے گھر آرام فرمالیں۔ صبح سواری نہیں

سواریاں مل جائیں گی۔ فرمانے لگے ''میں گھر کہہ آیا تھا کہ رات واپس آ جاؤں گا۔ آؤ تاج پورہ چلتے ہیں تانگہ مل جائے گا''۔ تاج پورہ آئے، کوئی تانگہ نہ ملا۔ اب وسن پورہ کو جا رہے تھے۔ وسن پورے سے چل کر کاچھو پورہ آئے، کوئی تانگہ نہ ملا۔ وہاں سے ہم دونوں نے ریلوے مال گودام کا رخ کیا۔ میں مولانا کو تسلی دیتا جاتا اور یہ شعر سناتا جاتا:

کس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو
راتوں کا پچھلا پہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ریلوے مال گودام چمڑا منڈی سے ایک تانگہ ملا۔ مولانا تانگے پر سوار ہوئے۔ میں پیدل واپس ہوا تو رات کی خاموشی میں مولانا کے تانگے کے گھوڑے کی سموں کی آواز سنتا تو مجھے ''کربلا والوں'' کے گھوڑے یاد آتے! بایں بے نیازی و بے اعتنائی۔ مجال ہے مولانا کی زبان پر کبھی شکوہ آیا ہو!

مولانا نورانی اور مولانا ازہری کا ایک جلسہ:

مجھے موچی دروازہ کا وہ جلسہ تو اب تک یاد ہے۔ جس میں آج سے پچیس سال قبل حضرت مولانا الشاہ احمد نورانی صدیقی اور حضرت علامہ الازہری کو خصوصی طور پر کراچی سے تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ جلسہ بڑا کامیاب رہا۔ موچی دروازے کا باغ، بے پناہ مجمع اور شعلہ بار تقریریں۔ جلسہ ختم ہوا تو کراچی کے یہ دونوں ''مہمانان گرامی'' غالباً اندھیرے میں کھو گئے اور ''میزبانان مقامی'' اس غلط فہمی سے اپنے مہمانوں کو فراموش کر گئے کہ شاید فلاں میزبان اپنی کار پر بٹھا کر گھر لے گیا ہوگا۔ سارا مجمع بکھر گیا۔ ہر شخص تقریروں کے نشے میں سرشار اپنے اپنے گھر روانہ ہوا۔ بعض سامعین کاروں پر سوار رواں دواں۔ حتیٰ کہ پولیس والے بھی تھکے ماندے اپنے اپنے تھانوں کی طرف جانے لگے۔

فیصل آباد (ان دنوں لائل پور) سے ایک عقیدت کا مارا مولوی رشید احمد نوری ان دو شعلہ بار مقررین کے ساتھ ''برکت علی محمڈن ہال'' کے فٹ پاتھ پر کھڑا ہر تانگے والے کو روکتا مگر اس اندھیری رات کے پچھلے پہر کوئی نہ رکتا۔ اب ''تینوں درویش'' پیدل موچی دروازے سے چلتے چلتے ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ نماز فجر ایک چھپے پر ادا کی اور کراچی جانے

والی پہلی گاڑی پر الوداع کہتے ہوئے روانہ ہوئے تاکہ کوئی ''لاہوری میزبان'' دیکھ نہ لے۔ مجھے کئی سال علامہ ازہری مرحوم سے ملاقات رہی۔ عرصہ تک الشاہ احمد نورانی صدیقی صدر جمعیۃ علمائے پاکستان سے نیازمندی رہی۔ مجال ہے ان بزرگوں نے لاہور کے میزبانوں کی بے اعتنائیوں اور موچی دروازے سے ریلوے اسٹیشن تک ''اندھیرے سفر'' کا کبھی تذکرہ نوک زبان پر رکھا ہو۔ کتنا ظرف تھا ان لوگوں کا!

چپ کی چپ اور بات کی بات — رکھ رکھا اس آنکھ کا دیکھ
سفر کی کالی لمبی رات — کٹتے کٹتی ہے

یہ تھے سنی علمائے کرام جو اپنے عوام کے ''حسن سلوک'' پر کبھی شکوہ بہ لب نہیں ہوتے تھے۔

اہلِ سنت کے مقررین کی اعزازی خدمات:

۱۹۵۵ء میں لاہور شہر کے چند سنی خطیبوں نے ایک انجمن بنائی اور اعلان کیا کہ ہر مقرر ''مفت'' تقریر کیا کرے گا۔ نہ خدمت، نہ وظیفہ، نہ نذرانہ، نہ تبرک، نہ کھانا، نہ کرایہ۔ اللہ اللہ!! علماء کرام اور یہ قربانیاں! اس ''انجمن مفت خطابی'' میں جو نوجوان علماء اہل سنت شامل تھے، ان میں جناب مولانا حافظ محمد عالم صاحب (جو بعد میں شیخ القرآن کے لقب سے سیالکوٹ میں دینی اہمیت کے مالک بنے) زینت القراء قاری غلام رسول صاحب (جو اپنی خوش آوازی اور قرآن خوانی کی بدولت ساری دنیا میں معروف ہوئے) حضرت مولانا الٰہی بخش صاحب (جو مستقبل میں ایک زبردست مناظر اور مقرر کی حیثیت سے ابھرے اور ''ضیائی نسبت'' سے پیر طریقت کی حیثیت سے معروف ہوئے) راقم الحروف (جو اپنی زندگی کی کامیابیوں میں ''سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر''...... کی عنایتوں سے نوازے گئے) مولانا محمد یوسف صاحب بوشیلا (جو بعد میں ایک مجذوب پیر طریقت کی حیثیت سے اہل دل کے قافلے تیار کرتے رہے) اس انجمن میں شامل تھے۔ اپنی سائیکلیں، اپنا کھانا، اپنی تقریریں، اپنا

جہان! لاہور کے لوگوں نے ان مقرر حضرات کو سرآنکھوں پر بٹھایا۔ مختلف علاقوں کی دینی انجمنیں وقت لیتیں، اشتہار چھپواتیں، اعلان کرتیں، اسٹیج سجاتیں، سپیکرز نصب کرتیں اور یہ نوجوان مقرر تقریریں کرتے اور رات کے پچھلے پہر جلسے ختم ہوتے تو اپنی اپنی سائیکلوں پر اپنے اپنے گھروں میں جا پہنچتے۔ ان علماء کرام کا یہ انداز اہل لاہور کو اتنا پسند آیا کہ شہر کے کسی نہ کسی علاقہ میں ہر رات جلسہ ہوتا اور یہ نوجوان علماء اپنے اپنے انداز میں تقریریں کرتے۔ قاری غلام رسول صاحب قرآن پڑھتے تو یوں محسوس ہوتا کہ دلوں پر قرآن نازل ہو رہا ہے۔ دل دھل جاتے، ذہن سکون حاصل کرتے۔ راستہ چلتے لوگ رک جاتے۔ ان دنوں کشمیری بازار لاہور میں نوجوانوں نے ایک مجلس ''اصلاح المسلمین'' کے نام سے بنائی۔ یہ لوگ قد آدم رنگین اشتہارات چھپواتے۔ لاہور کے بازاروں میں لگاتے، شاندار اسٹیج سجاتے اور مجھے یاد ہے کہ ہم اسٹیج کے مالک ہوتے اور یہ لوگ جلسہ گاہ کے چاروں طرف ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔ کبھی کبھی ان نوجوان مقررین کی اسٹیج پر صدارت کے لیے حضرت مولانا ابوالحسنات خطیب جامع مسجد وزیر خان، مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان صاحب نیازی بھی تشریف لاتے۔ جلسہ ختم ہوتا تو ہماری سائیکلوں کی گھنٹیاں بجتیں اور ہم رات کے اندھیروں کو چیرتے ہوئے اپنے اپنے ''غریب خانوں'' میں پہنچ جاتے۔ اور دل میں کہتے جاتے۔

ع آقا تیری خاطر شہر کے کوچے سجائے ہیں!

تقریر کے بعد پیسے وصول کرنا ایک روایت ہے اور اس میں ایک ''مزہ'' بھی ہے مگر تقریر کرنے کے بعد نذرانہ، کرایہ اور پیسے نہ لینے میں جو ''سرور'' ہے اسے میں اب تک نہیں بھول سکا۔ میرا دل اس ''نشہ'' سے ابھی تک سرشار ہے!

(''جہانِ رضا'' ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۵ء)

(''جہانِ رضا'' اگست، ستمبر ۲۰۰۵ء)

دار العلوم نعمانیہ لاہور کے علماء کرام

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی، ایم اے نے یہ مقالہ ''کنز الایمان سوسائٹی لاہور'' کے ماہنامہ ''کنز الایمان'' کے ''تحریک پاکستان نمبر'' کی تقریب رونمائی پر الحمراء ہال لاہور میں ۱۵ جنوری ۱۹۹۶ء کو پڑھا تھا۔ اس میں پیرزادہ اقبال احمد صاحب فاروقی نے ''دار العلوم نعمانیہ لاہور'' سے وابستہ چند علمائے کرام کی سیاسی اور علمی خدمات کو بیان کیا ہے۔ (مرتب)

صدر مکرم، علمائے کرام، مہمانانِ گرامی، بزرگانِ مجلس اور نوجوان عزیزو!

مجھے جس موضوع پر اظہار خیال کا موقع دیا گیا ہے، وہ ہے ''انجمن نعمانیہ لاہور کا تحریک پاکستان میں حصہ'' ہے۔ اس سے پہلے کہ میں ''انجمن نعمانیہ لاہور'' کے سیاسی کردار اور تحریک پاکستان میں انجمن کے اراکین کے عظیم کارناموں پر گفتگو کروں، میں یہ ضروری خیال کرتا ہوں کہ ''انجمن نعمانیہ لاہور'' کا مختصر سا تعارف کرادوں تاکہ آزادی وطن کے بعد آنکھ کھولنے والے حضرات کو معلوم ہو سکے کہ لاہور کی اس انجمن نے علوم اسلامیہ کی تدریس اور احیائے ملت کے لیے کتنا اہم کردار ادا کیا تھا۔ ''انجمن نعمانیہ'' آج سے ایک سو پچیس سال قبل یعنی ۱۸۸۶ء میں لاہور میں قائم ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی اقتدار کے سائے میں عیسائی مشنریوں کی یلغار اور دینی فتنوں کے طوفانوں کے سامنے مسلمانوں کے عقائد کی حفاظت کے لیے ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے، جو خالص دینی علوم کی اشاعت میں سرگرم عمل ہو۔ چنانچہ لاہور کے چند دردمند مسلمان آگے بڑھے۔ انہوں نے ''انجمن نعمانیہ'' کی بنیاد رکھی۔ ان بانیوں میں لاہور کے جلیل القدر علمائے کرام اور زعمائے ملت کے نام دکھائی دیتے ہیں۔ انجمن

کے بانیوں میں مولانا محرم علی چشتی، حکیم مفتی سلیم اللہ، نواب گورگانی، مولانا تاج الدین احمد، خلیفہ حمید الدین جیسے اساطین لاہور تھے۔ انجمن کی علمی اشاعت کے لیے ان عظیم الفضل علماء کرام کے نام سامنے آتے ہیں، ان میں مولانا غلام دستگیر قصوری، مولانا غلام اللہ قصوری، مولانا غلام قادر بھیروی، مولانا غلام محمد بگوی، مولانا عبداللہ ٹونکی، مولانا اصغر علی روحی، مولانا غلام احمد جیسے بلند پایہ ارباب علم وفضل کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔ (رحمۃ اللہ علیہم)

ان حضرات نے غلامی کے اندھیروں میں بے سروسامانی کے عالم میں ''دار العلوم نعمانیہ'' کی شمع کو روشن کیا۔ ابتدائی برسوں میں یہ دار العلوم شاہی مسجد لاہور میں قائم ہوا مگر طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر اس تاریخی مسجد کے قریب ہی ۱۹۱۱ء میں ایک علیحدہ عمارت میں دار العلوم قائم کیا گیا، جہاں ایک صدی گزرنے کے باوجود ابھی تک یہ تدریسی چشمہ رواں دواں ہے۔ جن دنوں ''انجمن نعمانیہ'' قائم ہوئی تھی، ان دنوں تحریک آزادی وطن یا تحریک پاکستان کا تصور تو موجود نہیں تھا مگر انجمن کے اراکین اور علماء کرام نے اس وقت کی بے دین قوتوں کے نظریات کا مقابلہ کرنے اور مسلمانوں کو دین اسلام سے وابستہ رکھنے کے لیے جو جدوجہد کی اس کے ثمرات بڑے دوررس ہوئے اور آگے چل کر فرزندانِ نعمانیہ نے آزادی وطن اور تحریک پاکستان میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ آج ان فرزندانِ نعمانیہ کی فہرست پر نگاہ ڈالی جائے تو ہمیں تحریک پاکستان میں حصہ لینے والے اکثر علمائے کرام اور سیاست دان نظر آتے ہیں، جو اس درس گاہ کے دسترخوان تعلیم و تربیت سے فیض یاب ہو کر نکلے تھے۔ امیر ملت پیر حافظ جماعت علی شاہ علی پوری، جنہوں نے تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا، اسی درس گاہ کے تربیت یافتہ تھے۔ پیر آف زکوڑی شریف، جنہوں نے سارے صوبہ سرحد میں قائداعظم کی رفاقت کا پرچم بلند رکھا، وہ مادر نعمانیہ کے نامور فرزند تھے۔ پیر آف مانکی شریف، جنہوں نے سارے مغربی قبائل میں تحریک پاکستان کو کامیاب کیا اور تحریک آزادی کشمیر میں قبائل کے ایک لاکھ

مجاہدوں کو میدان جہاد میں لا کھڑا کیا تھا، اسی دار العلوم کے علمی دستر خوان کے خوشہ چیں تھے۔ پاکستان کے تخیل کے خالق حضرت علامہ محمد اقبال ''دار العلوم نعمانیہ'' کے سالانہ جلسوں کی جان ہوا کرتے تھے۔ ہندوستان میں دو قومی نظریہ کے ترجمان امام اہل سنت اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے انجمن نعمانیہ کو اپنے ایسے تربیت یافتہ علماء کرام مہیا کیے تھے، جن میں ان کے جلیل القدر خلفاء مولانا وصی احمد سورتی، مولانا ظفر الدین رضوی بہاری، مولانا دیدار علی شاہ الوری رحمۃ اللہ علیہ کے نام ''انجمن نعمانیہ'' کی تاریخ میں درخشاں نظر آتے ہیں۔

حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ نعمانیہ کے تلامذہ کی صف میں نہیں آتے، مگر وہ جب لاہور آتے تو اپنا اکثر وقت ان عزیز اساتذہ میں گزارتے، جو نعمانیہ میں دینی علوم کی تدریس میں مصروف تھے۔ سندھ کے معروف پیر آف بھر چونڈی شریف جنہوں نے قائداعظم کی قیادت میں تحریک پاکستان میں نمایاں حصہ لیا، اسی ''انجمن نعمانیہ'' کے تربیت یافتہ تھے۔

مولانا محمد بخش مسلم بی-اے:

تحریک پاکستان میں جن فرزندان نعمانیہ نے بھرپور حصہ لیا، ان میں مولانا محمد بخش مسلم مرحوم کا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ آپ اس زمانے میں دار العلوم نعمانیہ میں زیر تعلیم رہے تھے، جب مولانا غلام مرشد مرحوم دار العلوم کے اساتذہ کی ٹیم میں تھے۔ مولانا مسلم نے تحریک پاکستان میں بڑا نمایاں کام کیا۔ وہ لوہاری دروازے کے باہر وسیع باغ میں جہاں ان دنوں مسلم مسجد کھڑی ہے، تحریک پاکستان کے حق میں زبردست لیکچر دیا کرتے تھے۔ وہ اپنی تقاریر میں اردو، پنجابی اور انگریزی میں یکساں اظہار خیال کیا کرتے تھے اور اپنے سامعین سے تحریک پاکستان کی اہمیت پر بڑی جامعیت سے گفتگو کرتے۔ وہ تحریک پاکستان کے دنوں میں سارے پنجاب میں مسلم لیگ کے جلسوں سے خطاب کرتے۔ بمبئی سے لے کر پشاور تک شاید ہی کوئی ایسا شہر

اور جہاں مولانا محمد بخش مسلم مرحوم کی آواز نہ گونجی ہو۔

آج کی محفل کے صدر نشین مجاہد ملت مولانا عبدالستار خاں صاحب نیازی تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن رہے ہیں۔ وہ قائداعظم کے سپاہی رہے ہیں۔ انہوں نے تحریک پاکستان میں پرجوش حصہ لیا۔ یہ مجاہد ملت ''انجمن نعمانیہ'' میں کئی سال تک ایڈمنسٹریٹر رہے ہیں اندریں حالات ہم انہیں ''انجمن نعمانیہ'' کا نامور فرزند تصور کرتے ہیں۔ مولانا عبد الستار خاں نیازی ''تحریک ختم نبوت'' کے ڈکٹیٹر بنے تو ان کی تقریروں سے مسجد وزیر خان کے در و دیوار گونج اٹھے تھے۔ ملک کے غدار اس شیر کی دھاڑ کے سامنے لومڑ دکھائی دیتے تھے۔ تحریک پاکستان کے یہ نامور مجاہد قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کے پسندیدہ نوجوان تھے۔

''انجمن نعمانیہ'' کے نامور فرزندوں میں سے ایک نوجوان، جس نے تحریک پاکستان میں شب و روز کام کیا، وہ علامہ علاء الدین صدیقی مرحوم تھے، جو علوم دینیہ تو ''دار العلوم نعمانیہ'' سے حاصل کر کے نکلے مگر ترقی کرتے کرتے پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، جو ملک کے عظیم دانشور اور دنیائے اردو کے بلند پایہ ترجمان تھے، جب ہزارہ سے چل کر پہلی بار لاہور آئے تو انہیں دار العلوم نعمانیہ میں موذن مقرر کیا گیا۔ موذن ان دنوں ''بانگا'' کہلاتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد مولانا غلام مرشد انہیں اپنے ساتھ سنہری مسجد لاہور میں لے گئے اور وہ ایک عرصہ تک اسی مسجد میں اذان دیتے رہے۔ ترقی کے زینوں پر قدم رکھتے ہوئے جب سید عبداللہ اورینٹل کالج کے پرنسپل بنے اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے بورڈ آف ڈائریکٹر کے چیئرمین بنے تو ان کا نام علمی اور ادبی دنیا میں بڑا بلند پایہ تھا۔ وہ سرکاری ملازمت کی وجہ سے تحریک پاکستان میں عملی حصہ تو نہ لے سکے لیکن ہم فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ دار العلوم نعمانیہ کا ''بانگا'' دنیائے علم و ادب میں روشنیاں پھیلاتا رہا۔ تحریک پاکستان کے دوران میں نے حضرت محدث کچھوچھوی کو ''دار العلوم نعمانیہ'' کے سٹیج پر علماء اہلسنت کو آزادی وطن کیلئے متحد کرتے پایا۔ حضرت محدث کچھوچھوی کی کوششوں سے جب ۱۹۴۶ء

میں ''بنارس سنی کانفرنس'' منعقد ہوئی تو محدث رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک پر دارالعلوم کے سارے اساتذہ کانفرنس میں شرکت کے لیے بنارس پہنچے۔

حضرات محترم! اس مختصر سے وقت میں ''انجمن نعمانیہ'' کے کس کس فرزند کا نام لوں، کس کس عالم دین کی خدمات بیان کروں، کس کس دینی رہنما کی یاد تازہ کروں۔ ان علماء کرام نے تحریک پاکستان میں جو اہم کردار ادا کیا، وہ ''انجمن نعمانیہ'' کی تدریسی بساط کا ثمرہ ہے۔ آج پاکستان کی سرزمین پر جب ہم ان لوگوں کو قیادت کے جھنڈے اٹھائے دیکھتے ہیں جو ہندو کانگریس کے کیمپوں کے سامنے ''جے جے نہرو، جے جے رام'' کے نعرے لگایا کرتے تھے تو یہ شعر یاد آتا ہے کہ

نیرنگیِ سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل انہیں ملی، جو شریکِ سفر نہ تھے

میں ایسے نیشنلسٹ علماء کے تذکرہ سے اس پاکیزہ محفل کو افسردہ نہیں بنانا چاہتا مگر اتنا ضرور کہوں گا ''فرزندان نعمانیہ'' نے تحریک پاکستان میں جس پامردی سے حصہ لیا ہے، وہ پاکستان کی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔ آج اگرچہ یہ عظیم الشان انجمن اپنوں کی بے رخی کی وجہ سے اپنا تاریخی مقام برقرار نہیں رکھ سکی، مگر اس کے در و دیوار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ آزادی وطن کے کارواں یہاں سے نکلے تھے۔ تحریک پاکستان کے دینی مجاہد یہاں سے تربیت پا کر آگے بڑھے تھے۔ آزادی وطن کے متوالے یہاں سے ہی علم آزادی اٹھائے آگے بڑھتے گئے۔ ''دارالعلوم نعمانیہ'' کے درویشوں اور بوریا نشینوں نے باطل کے تاج و تخت کو ہلا کر رکھ دیا۔

؎ قلندراں کہ بہ تسخیر آب و گل کوشند   زشاہاں تاج ستانند و خرقہ بردوش اند

(''جہانِ رضا'' جنوری، فروری ۱۹۹۶ء)

علماءِ کرام کی یادیں اور اہلِ علم و فضل کی لطیف باتیں

حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ:

میں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت تو نہیں کی مگر میرے استاد مکرم شیخ الجامعہ ''جامعہ عباسیہ بہاولپور'' مولانا غلام محمد گھوٹوی اکثر اپنے مرشد پیر آف گولڑہ شریف کی باتیں سنا کر ہمارے دل و دماغ کو تازہ کر دیا کرتے تھے۔ اپنے پیر و مرشد کی باتیں اس انداز سے بیان کرتے کہ آج نصف صدی گزرنے کے باوجود وہ باتیں اور وہ یادیں حاشیۂ دماغ میں ابھی تک محفوظ ہیں۔ آپ ایک دن فرمانے لگے کہ برصغیر میں انگریزی اقتدار کے زیر سایہ بڑے بڑے مشنری پادری مغربی ممالک سے درآمد کیے گئے تاکہ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو مغربی روایات میں بدل دیا جائے۔ یہ پادری بڑے پڑھے لکھے ہوتے تھے اور مذاہب عالم کی تاریخ و تمدن سے واقف بھی ہوتے تھے۔ مشنری کالج کا ایک ماہر ریاضی پادری اپنی علمیت کا لوہا منوانے کے لیے ایک دن گولڑہ شریف میں حضرت گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں آ پہنچا اور آپ سے سوال کرنے لگا: ''پیر صاحب! آپ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ قرآن پاک میں ہر چیز کا ذکر موجود ہے۔ آپ کے نبی کے نواسے امام حسین اور امام حسن کی زندگیوں میں چھ سات برس تک قرآن نازل ہوتا رہا۔ پھر ان دونوں نواسوں نے اسلام کے لیے قربانیاں بھی دیں اور آج تک ساری امت ''یاحسین! یاحسین! یاحسین!'' پکارتی ہے مگر ان حضرات کا قرآن میں نہ کہیں ذکر ہے، نہ نام و نشان ہے؟'' آپ نے پادری سے دریافت فرمایا: ''آپ نے قرآن کا مطالعہ کیا ہے؟'' اس نے کہا: ''مطالعہ بھی کیا ہے اور قرآن کا ایک نسخہ اب بھی میری جیب میں موجود ہے''۔ اس نے جیب سے قرآن نکالا۔ حضرت نے فرمایا: ''پادری

صاحب! اسے کھول کر جہاں سے دل آئے پڑھیں''۔ اس نے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھی تو آپ نے فرمایا: ''پادری صاحب! بس قرآن سے آپ نے حضرت حسن اور حسین کا ذکر تو سنا دیا۔ آپ حساب دان ہیں۔ قلم نکالیے اور ایک کاغذ پر لکھیے''۔

امام حسین کے عدد ۲۱۰ ہیں۔ آپ کا سنہ پیدائش ۴ ہجری ہے۔ آپ کا سنہ شہادت ۶۱ ہجری ہے۔ آپ کی جائے شہادت ''کرب وبلا'' کے ۲۶۱ عدد ہیں۔ امام حسن کے اعداد ۲۰۰ ہیں۔ آپ کا سنہ شہادت ۵۰ ہجری ہے اب ان سب کو جمع کریں''۔ پادری نے سب کو جمع کیا تو حاصل جمع ۷۸۶ نکلا۔ پیر صاحب نے فرمایا: ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے اعداد ۷۸۶ ہیں۔ آپ قرآن میں امام حسن و حسین کا نام تلاش کرتے تھے۔ اس میں تو ان کی پوری سوانح موجود ہے''۔ آپ نے مجلس میں بیٹھے ہوئے علماء کرام کو مخاطب کر کے فرمایا: ''پادری صاحب نے سارا قرآن پڑھ لیا۔ انہیں حسن و حسین کا نام نہیں ملا۔ ہم نے اپنے استادوں سے صرف بسم اللہ پڑھی تو خاندان نبوت کے حالات زندگی پا لیے''۔ مولانا غلام محمد گھوٹوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''میں نے اس پادری کو اسلام لانے کے بعد حضرت کے پیچھے نماز پڑھتے دیکھا''۔

مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقشبندی:

صاحب ''تفسیر نبوی'' بڑے راسخ العقیدہ عالم دین مگر صوفی منش بزرگ تھے اور میرے استاد تھے۔ آپ علم وفن میں حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد بھی تھے اور ''سلسلہ نقشبندیہ'' میں خلیفۂ مجاز بھی۔ آپ کی رحلت کے بعد آپ حضرت لاثانی پیر سید جماعت علی شاہ علی پوری سے بیعت ہوئے اور خلافت پائی۔ آپ کی ساری عمر عقائدِ باطلہ کے رد میں گزری۔ پندرہ جلدوں میں تفسیر قرآن لکھی۔ آپ نے حافظ ولی اللہ مناظر اسلام نائب خطیب شاہی مسجد کا ایک واقعہ سنایا کہ حافظ ولی اللہ نابینا تھے مگر عیسائی پادریوں سے مناظرہ کرتے تو انہیں شکست فاش سے عاجز کر دیتے۔ انہیں قرآن پاک تو حفظ تھا ہی مگر ساتھ ساتھ انہیں انجیل کے اکثر مقامات

تھے۔ ان دنوں عیسائیوں کا ایک زبردست پادری فادر فاونڈر علمائے اسلام کو مناظرے کے لیے للکارتا اور پنجاب بھر میں مناظرے کرتا۔ ایک بار اس نے علمائے اور کو مناظرے کے لیے للکارا اور لاہور میں اسلام اور عیسائیت پر مناظرے کا میدان گرم ہوا۔ سات دن تک مناظرہ ہوتا رہا۔ اس زمانے میں مناظرے ہوتے مگر کوئی فریق اشتعال اور جذبات سے مغلوب نہ ہوتا تھا۔ دونوں نظریات کے مناظر اور سامعین برداشت کا مظاہرہ کیا کرتے تھے اور سکون کے ساتھ دلائل سنا کرتے تھے۔

حافظ ولی اللہ ان دنوں لاہور سے باہر تھے۔ وہ ساتویں دن لاہور آئے تو مناظرے کی سٹیج پر جا پہنچے اور پادری فاونڈر کو للکار کر کہا ''میں ہوں حافظ ولی اللہ! اب میں مناظرہ کروں گا''۔ حافظ ولی اللہ کی آواز بڑی گرجدار تھی۔ پادری فاونڈر نے دیکھا کہ ایک اندھا مولوی گرج رہا ہے۔ اس نے حافظ ولی اللہ کو حقیر جانتے ہوئے کہا: ''اس اندھے کو بھی آنے دو!''

حافظ ولی اللہ نے بھرے مجمع میں اعلان کیا کہ جب تک میں اپنے مدمقابل کو اپنی آنکھوں کی بجائے ہاتھوں سے ٹٹول کر جائزہ نہ لے لوں، مناظرہ شروع نہیں کروں گا۔ پادری فاونڈر نے یہ بات منظور کرتے ہوئے حافظ ولی اللہ کو اپنے قریب بلا لیا۔ حافظ صاحب نے پادری کا چہرہ اپنے ہاتھوں سے ٹٹولا۔ گھنی لمبی داڑھی، سر پر ہولہ کا ہیٹ، گلے میں صلیب کی زنجیر اور بڑا دیوہیکل پادری! حافظ ولی اللہ نے پادری کا چہرہ ٹٹولتے ہوئے اس کی گال پر ایک زوردار طمانچہ مارا جس سے سارا مجمع ہل گیا۔ ایک شور برپا ہو گیا۔ سارے مجمع میں افراتفری کا منظر تھا۔ سٹیج درہم برہم ہو گیا۔ پولیس آگے بڑھی اور حافظ ولی اللہ کو ارادۂ قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ پادری فاونڈر نے ایف۔ آئی۔ آر درج کرائی، اس میں حافظ ولی اللہ کے خلاف ارادۂ قتل کے لیے حملہ، دھوکا دہی اور ایک مذہبی راہنما کو برسر عام طمانچہ مار کر عیسائیوں کے جذبات مجروح کرنے کے الزامات عائد کیے گئے۔

ابتدائی عدالت نے (جس کا مجسٹریٹ ایک مسلمان تھا) فرد جرم عائد کرتے ہوئے حافظ ولی اللہ کو مختلف جرائم کا مرتکب قرار دیا۔ اب یہ مقدمہ سماعت کے لیے ''سیشن کورٹ لاہور'' میں گیا، جس کا جج ایک انگریز تھا۔ حافظ ولی اللہ نے اپنے خلاف تمام الزامات کی تردید کی اور بتایا کہ وہ پادری فاونڈر کو نہ تو قتل کرنا چاہتے تھے نہ دھوکا دینا چاہتے تھے اور نہ عیسائیوں کی دل آزاری مطلوب تھی۔ میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آیا پادری فاونڈر عیسائی بھی ہے یا نہیں۔ کیونکہ انجیل میں لکھا ہوا ہے کہ ''عیسائی وہ ہوتا ہے جسے اگر ایک گال پر طمانچہ مارا جائے تو وہ دوسرا گال پیش کر دیتا ہے''۔ میں یہ ٹیسٹ کرنا چاہتا تھا کہ میرا مد مقابل انجیل پر ایمان رکھتا ہے یا نہیں''۔ یہ کہتے ہوئے حافظ ولی اللہ نے عدالت میں انجیل کے بیس نسخے پیش کیے جن میں یہ بات بلا تحریف موجود تھی۔ حافظ صاحب نے عدالت کو مزید بتایا کہ فلاں لائبریری میں فلاں مطبع کی چھپی ہوئی فلاں انجیل موجود ہے۔ اس کے فلاں صفحے پر یہ بات موجود ہے۔ اس طرح آپ نے چالیس ایسے ایڈیشنوں کی نشاندہی کی، جس کو سن کر جج نے حیران ہو کر قلم منہ میں دبا لیا کہ ایک نابینا مسلمان عالم اور حافظے کی یہ گہرائی ہے۔ وہ بے حد متاثر ہوا۔ پادری فاونڈر سے عدالت نے پوچھا کہ آپ انجیل کے اس ارشاد کی روشنی میں اپنے عیسائی ہونے کا دفاع کن الفاظ میں کریں گے۔ پادری فاونڈر نے عدالت کو بتایا کہ وہ انجیل کو نہیں جھٹلاتے اور اپنا مقدمہ واپس لیتے ہیں اور اعلان کیا کہ انجیل کے ارشاد کے مطابق واقعی مجھے چاہیے تھا کہ میں اپنا دوسرا گال پیش کر دیتا۔ آج کے بعد میں حافظ ولی اللہ سے کبھی مناظرہ نہیں کروں گا۔

تحریف القرآن پر ایک مناظرہ:

میرے والد مکرم اگرچہ پیر تھے مگر وہ علماء کرام کی بڑی عزت کرتے تھے۔ جہاں کہیں کسی عالم دین کی آمد کا سنتے ہمہ تن شوق بن کر دست بوسی کے لیے جا پہنچتے اور نذرانہ پیش کرتے۔ بچپن میں مجھے ان کی وساطت سے کئی عالمان دین کی زیارت کا

موقع ملا۔ ہمارے علاقہ میں ان دنوں اعلان ہوا کہ ''وزیر آباد'' کے مضافات میں شیعہ سنی مناظرہ ہو رہا ہے۔ دونوں طرف سے بڑے بڑے جید علماء کرام اور مشہور شیعہ علماء دین اس مناظرہ میں شریک ہوئے۔ ہزاروں شیعہ سنی سامعین دور دور سے آ کر اس مناظرہ میں جمع تھے۔ میرے والد بھی اپنے مریدوں کی ایک جماعت لے کر وزیر آباد پہنچے۔ ان دنوں ایک سنی عالم دین ''باہری والا مولوی'' جس کا اصل نام اب مجھے یاد نہیں رہا، زبردست مناظر مانا جاتا تھا۔ مناظرہ کا موضوع ''قرآن میں تحریف'' تھا۔ شیعہ علماء کہتے تھے کہ تین خلفاء کے زمانے میں، پھر بنو امیہ نے اپنے زمانہ اقتدار میں قرآن میں تحریف کر دی تھی اور جہاں جہاں اہل بیت کی تعریف کی آیات تھیں، انہیں قرآن سے نکال دیا تھا۔ بعض شیعہ تو یہاں تک کہتے تھے کہ جن آیات قرآنیہ پر اہل بیت کی تعریف و تحسین تھی، انہیں حضرت عائشہ کی بکری کھا گئی تھی۔ دو دن مناظرہ کا بازار گرم رہا۔ تیسرے دن ''مولوی باہری والا'' مناظرہ کے مجمع میں آ پہنچا اور سٹیج پر جا کر مناظرہ کرنے کی اجازت چاہی۔ وہ شیعہ مناظر کے مقابلہ میں اپنے دلائل کے لیے اٹھا۔ اٹھتے ہی خطبہ پڑھا اور اس میں ''الحمد لله رب العٰلمين'' کی بجائے ''الحمد لله ربَ العٰلمين'' ادا کیا۔ شیعہ مجتہد نے ٹوکا۔ سٹیج پر بیٹھے سنی علماء نے بھی مولوی صاحب کو روکا۔ آپ نے رک کر دوبارہ خطبہ پڑھنے کی اجازت چاہی۔ دوسری بار پھر ''ربِ العٰلمین'' کی بجائے ''ربَ العٰلمین'' پڑھا۔ اب تو مقابل میں سارے شیعہ مجتہد اٹھ کھڑے ہوئے۔ سنی علماء بھی بیزار ہوئے کہ ہمارا مناظر کیا کر رہا ہے۔ سارے مجمع میں شور مچ گیا۔ مولوی صاحب نے لوگوں سے دوبارہ معافی مانگی۔ جب مجمع میں ٹھہراؤ ہوا تو تیسری بار پھر انہوں نے ربَ العٰلمین پڑھا۔ اب تو لوگوں کی بے چینی کی انتہا نہ رہی۔ شیعہ علماء کہنے لگے ''اس جاہل مولوی کو بٹھاؤ''۔ سنی علماء بھی سرنگوں ہو گئے۔ مجمع میں بے زاری کا طوفان برپا ہو گیا۔ اس موقع پر مولوی باہری والا گرجا اور کہنے لگا: حضرات! آج ہم چودھویں صدی کے لوگ ہیں۔ میں نے قرآن پاک کے

ایک حرف پر زیر کی بجائے زبر پڑھ دی تو سارا مجمع چیخ اٹھا ہے۔ سارے عالم اسلام
کر رہے ہیں، سارے شیعہ تڑپ رہے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں جب خلافت راشدہ
کے زمانے میں قرآن کے دس سپارے منسوخ کر دیے گئے، جب قرآن سے
اہل بیت کی تعریف کی آیات ختم کر دی گئی تھیں، جب حضرت عائشہ کی بکری اہل بیت
کی تعریف کا حصہ کھا رہی تھی تو کسی مسلمان کو، کسی صحابی، کسی عاشق رسول اور کسی اہل
بیت کے فرد کو حتیٰ کہ حضرت علی شیر خدا کو آواز اٹھانے کی جرات نہ ہوئی؟ حسن نہیں
بولے، حسین نہیں بولے۔ بنو امیہ کے زمانے میں امام جعفر صادق نہیں بولے۔ آج
اس گئے گزرے زمانے میں کوئی مسلمان قرآن کے کسی لفظ پر زیر کی بجائے زبر پڑھنے
کی اجازت نہیں دیتا۔ مگر جن کے سامنے قرآن نازل ہوا تھا، جن کے واسطے قرآن
نازل ہوا تھا، جن لوگوں نے اپنے نبی پر قرآن نازل ہوتے دیکھا اور اپنے نبی کی
زبان سے قرآن سنا، وہ کئی سپارے گم کرنے پر کیوں خاموش رہے؟

مجھے یاد ہے کہ اب مجمع خاموش تھا۔ شیعہ خاموش تھے مگر مولوی باہری والا گرج
رہا تھا۔ مجمع اس کے کنٹرول میں تھا۔ وہ مجمع میں چھایا ہوا تھا۔ وہ قرآن میں تحریف کے
خلاف دلائل دے رہا تھا۔ تحفظ قرآن پر آیات تلاوت کر رہا تھا، احادیث سنا رہا تھا۔
اس طرح وہ ایک گھنٹہ تقریر کرتا رہا۔ جب تقریر ختم ہوئی، شیعہ مجتہد اپنی اپنی کتابیں بغل
میں دبائے بھاگ رہے تھے اور عام شیعہ منہ لٹکائے گھروں کو جا رہے تھے۔

یادش بخیر پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان مرحوم بڑے زوردار وزیر
اعظم تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ ''رعنا لیاقت علی'' ایک ہندو خاتون تھیں، جس نے اسلام قبول
کر لیا تھا۔ بڑی خوبصورت اور خوش لباس عورت تھی۔ اس نے پاکستانی تہذیب میں
سب سے پہلے ''غرارے'' کو رواج دیا اور اعلیٰ سوسائٹی کی پاکستانی خواتین ''غرارے''
پہن کر سر بازار آنے لگیں۔ رعنا لیاقت علی نے پاکستان میں عورتوں کو پردے سے باہر
لانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ آل پاکستان ویمن آرگنائزیشن (اپواء) کی بنیاد

رکھی۔ اگر چہ آگے چل کر جنرل ایوب خان نے اپنی آمریت کے دور اقتدار میں
مسلمان عورتوں کو پردے سے باہر لانے کو رواج دیا اور اس کے بعد ذوالفقار علی بھٹو تو
عورتوں کو پکڑ پکڑ کر پردے سے باہر لائے اور ''ہے ہے جمالو'' کی تان پر پاکستانی
خواتین اپنے گھروں سے باہر نکلیں مگر پاکستان بننے کے بعد سب سے پہلے خواتین کو
بے پردہ کرنے کا سہرا بیگم رعنا لیاقت خان کے سر ہے۔ اس نے لاہور میں آ کر اعلان
کیا کہ وہ اسمبلی ہال کے سامنے پانچ سو خواتین کو غرارے پہنا کر بے پردگی کا مظاہرہ
کریں گی۔ رعنا لیاقت علی خان کے اس اعلان نے ملک کے دینی حلقوں میں اضطراب
اور اضطرار پھیلا دیا۔

ابوالنور مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں:

ان دنوں ابوالنور مولانا محمد بشیر صاحب کوٹلی لوہاراں بڑی زوردار تقریریں کیا
کرتے تھے۔ وہ لاہور پہنچے اور انہوں نے اس اعلان بے پردگی کے خلاف ایک
زبردست احتجاجی جلسہ کیا۔ مولانا محمد بشیر شیخ الحدیث مولانا محمد شریف آف کوٹلی
لوہاراں کے نامور فرزند ارجمند ہیں۔ مرکزی دارالعلوم حزب الاحناف لاہور سے آج
سے ساٹھ سال پہلے دستار فضیلت لے کر میدان خطابت میں آئے۔ ان کی تقریروں
میں جوش بھی تھا اور خطاب میں بقدر ضرورت مزاح بھی۔ وہ ایک طرف تو عام جلسوں
میں تقریر کرتے اور جلسہ لوٹ لیتے۔ دوسری طرف ان کا خوشگوار قلم ''ماہ طیبہ'' کوٹلی
لوہاراں سیالکوٹ کے کالموں میں گلہائے رنگا رنگ بکھیرتا اور لوگ ان کی تقریر اور تحریر
دونوں کے گرویدہ تھے۔ روزنامہ ''زمیندار'' لاہور میں مزاحیہ کالم عطا محمد چشتی بہ تخلص
''حاجی لق لق'' لکھا کرتے تھے مگر ابوالنور مولانا محمد بشیر صاحب ''ماہ طیبہ'' کے صفحات
پر ''حاجی حق حق'' کے تخلص سے بڑی مزاحیہ نظمیں لکھتے تھے۔

مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں نے اپنی تقریروں کے زور سے سارے پنجاب کو ہی
نہیں، سارے برصغیر کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ وہ خوش آواز تھے، جوش میں تقریر کرتے تو مجمع

پرچھا جاتے۔ ترنم کے ساتھ شعر پڑھتے، دلوں کو موہ لیتے۔ انہوں نے زبان وقلم سے یکساں اسلام کی ترجمانی کی اور اہل سنت کے نظریات کو پھیلایا۔ ان کی بے شمار تقریروں کے علاوہ ان کی نہایت بلند پایہ اور عمدہ کتابیں ''واعظ، الخطبات، الخطیب، عورتوں کی حکایات، شیطان کی حکایات اور مثنوی کی حکایات کے ناموں سے سامنے آئیں۔ آج ساٹھ سال گزرنے کے بعد ہمارے عزیز دوست مولانا ضیاء اللہ قادری صاحب ان کے ماہنامہ ''ماہ طیبہ'' کو سیالکوٹ سے چلا رہے ہیں اور سید اعجاز احمد شاہ مالک ''فرید بک سٹال'' اردو بازار لاہور سے ان کی کتابیں شائع کر رہے ہیں اور ان کا قلمی فیض رواں دواں ہے مگر آج نہ ''حاجی حق حق'' کی مزاحیہ نظمیں اور نہ مولوی بشیر کوٹلی لوہاراں کی للکار سنائی دیتی ہے۔

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے ''زلف ایاز'' میں

یہی ابوالنور مولانا محمد بشیر صاحب کوٹلی لوہاراں سیالکوٹ سے چل کر لاہور کے جلسے میں آئے۔ اس وقت کے وزیراعظم پاکستان خان لیاقت علی خان کی بیگم رعنا لیاقت علی صاحبہ کو جلسہ عام میں للکارا۔ اس کے غرارے پر ایک مزاحیہ نظم سنائی، جس پر لاہورئیے لوٹ پوٹ ہوتے گئے۔ پھر پورے دو گھنٹے پردے پر دلائل دیتے گئے۔ میں ان دنوں طالب علم تھا۔ مجھے دلائل کی گہرائیاں تو یاد نہ ہوتی تھیں مگر جب انہوں نے اپنی خاص طرز اور لے میں لاہور والوں کو مخاطب کیا ''توں قصائی دی دکان تے جانا ایں! سیر گوشت لینا ایں! قصائی تینوں گوشت دیندا اے! اربی دیاں پتیاں وچ چھپا کے دیندا اے۔ فیر توں کاغذ دے لفافے وچ چھپا لینا ایں۔ فیر توں کپڑے دے رومال، دستر خوان وچ بن لینا ایں۔ اونہوں چھپانا ایں۔ اوہ توں انج کیوں کرنا ایں'' خود ہی گرج کر بتایا ہاں ہاں! اس لیے کہ ایک سیر گوشت کا ٹکڑا ننگا دیکھ کر کوئی کوا نہ جھپٹ پڑے، کوئی چیل نہ جھپٹے، کوئی گدھ نہ چھین لے، کوئی کتا نہ سونگھ لے، کوئی بلا نہ اچھل پڑے۔ مولانا

آپ نے یہ مثال پیش کرنے کے بعد زور سے للکارا ''او لیاقت علی خان ہوش کرو''۔ لاہور کے مسلمان تو بکری کے ایک سیر گوشت کی اتنی حفاظت کرتے ہیں اور پردے میں رکھتے ہیں مگر تمہاری بیگم کی ڈیڑھ من کی لاش اپنی سہیلیوں کو سولہ سنگار کر کے مال روڈ پر مظاہرہ کر رہی ہے۔ کیا ان پر کوئی کوا، کوئی چیل، کوئی کتا، کوئی بلا نہیں جھپٹے گا۔ انہیں پردوں میں رکھو، گھروں میں رکھو! اپنی نظروں کے سامنے رکھو، انہیں حیا میں رکھو! ان کو سنبھالو نہیں تو انہیں کوے چیلیں کھا جائیں گے۔

مولانا محمد عمر اچھروی رحمۃ اللہ علیہ:

بڑے بلند پایہ عالم دین، خطیب اور مناظر تھے۔ وہ قصور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ پنجاب اور دہلی کے دینی مدارس میں تعلیم حاصل کی۔ اہل حدیث کے دار العلوم سے سند فضیلت پائی مگر اعتقادی طور پر بڑے پختہ ذہن کے آدمی تھے۔ ان کی تقریریں اردو اور پنجابی میں ہوتیں۔ خاص انداز میں اور میٹھی طرز میں قرآن پڑھتے تو ان کی آواز کانوں میں سماتی جاتی۔ وہ محنت شعار اور شب بیدار عالم دین تھے۔ مجھے ان سے شرف نیاز اس وقت حاصل ہوا، جب وہ اپنی مناظرانہ شہرت کی بلندیوں پر تھے۔ وہ ''حضرت داتا گنج بخش لاہور'' کی مسجد کے جب اعزازی خطیب مقرر ہوئے تو مجھے مولانا محمد بخش مسلم اور مولانا محمد شریف نوری مرحومین کی رفاقت میں مولانا محمد عمر کی مجالس میں بیٹھنے کا زیادہ موقع ملا۔ وہ فن مناظرہ میں بے مثال شخصیت کے مالک تھے۔ طبیعت کے ٹھنڈے، اصول کے پکے، للکار میں شیر، مخالف پر مناظرانہ وار کرنے میں دلیر اور مخالف کا وار سہنے میں بڑا جگرا رکھتے تھے۔ وہابیوں کے صف اول کے مناظر ان کی زد میں ہوتے۔ مولوی عبداللہ روپڑی لاہور، مولوی غلام اللہ خان راولپنڈی، شیعہ مجتہدین اور دوسرے عقیدوں کے بڑے بڑے مولوی ان کے سامنے ٹھہر نہ سکتے تھے۔ جہاں کوئی بدعقیدہ مولوی سر اٹھاتا تو آپ وہاں کے لوگوں کی دعوت پر خم ٹھوک کر جا پہنچتے تھے اور مناظرانہ انداز میں انہیں للکارتے۔ انہوں نے مناظرانہ انداز میں ''مقیاس وہابیت، مقیاس

حنفیت، مقیاس خلافت، مقیاس نور، مقیاس صلوٰۃ اور مقیاس مناظرہ'' جیسی کتابیں لکھیں مقیاس مناظرہ میں انہوں نے اپنے مناظروں کی روئیداد بھی لکھی ہے اور مخالفین کے اعتراضات کا جواب بھی لکھا ہے۔

پاکستان میں ایک ایسا دور بھی آیا، جب سنی اور دیوبندی علمائے کرام اعتقادی موضوعات پر آپس میں الجھ پڑے۔ دونوں طبقوں کے علماء اپنی اپنی تقریروں تحریروں، جلسوں اور خطبوں میں ایک دوسرے کے خلاف پرجوش بیان بازی کرتے تقریروں کے علاوہ دونوں طبقوں کے اخبارات، رسالے، میگزین اور کتابیں ایک دوسرے کے خلاف زبردست مکالمے لکھا کرتے۔ ان دنوں شورش کاشمیری کا ہفت روزہ ''چٹان'' اس ''جنگ'' میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ شورش کا قلم ہجو نگاری میں برہنہ شمشیر تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ''سودا کا غنچہ'' اس کے قلم کی نوک پر ناچ رہا ہے۔ اپنے مخالفین پر زبردست وار کرتا اور اسے اپنے بیگانے سب خریدتے اور پڑھتے شورش کاشمیری نے ''چٹان'' کے ایک شمارے میں ایک شعلہ بداماں ہجو یہ نظم لکھی جس کا عنوان تھا ''اچھرے کا ابوجہل''۔

نظم کا ایک ایک شعر مولانا اچھروی مرحوم کے خلاف تیغ و سناں بن کر آیا تھا مگر مولانا بے خبر تھے کہ ان کے خلاف کیا کیا لکھا جا رہا ہے۔ میرے دوست بشیر حسین صاحب ناظم نے مولانا کو بتایا کہ آج شورش کاشمیری نے آپ کو ''اچھرے کا ابوجہل'' لکھا ہے اور آپ کی ذات پر نظم میں زبردست حملے کیے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ ناظم صاحب کی اس اطلاع پر مولانا اچھروی سٹپٹا جائیں گے مگر مولانا کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اپنے بیٹے عبدالوہاب (جو بعد میں برطانیہ میں جا کر پیر طریقت کی حیثیت سے مشہور ہوئے) کو بلایا اور جیب سے کچھ پیسے نکال کر دیے اور کہا! سائیکل پر جاؤ اور ''چٹان'' کے پانچ رسالے لاؤ۔ ہم بھی دیکھیں ''اچھرے کے ابوجہل'' کیسے ہوتے ہیں! عبدالوہاب رسالے لایا تو مولانا اچھروی نے اپنے عقیدت

مندوں کی بھری محفل میں بشیر حسین صاحب ناظم کو کہا ناظم صاحب شورش نے ہماری ''تعریف'' میں جو کچھ لکھا ہے، اسے پڑھ کر سناؤ! ہم حیران تھے کہ مولانا اپنی ہجو اپنے عقیدت مندوں کی محفل میں سنانے کا کہہ رہے ہیں۔ تاہم بشیر حسین صاحب ناظم نے بڑے چٹخارے لے لے کر مولانا کے خلاف نظم بھری محفل میں سنائی۔ مجال ہے مولانا کے چہرے پر کوئی شکن بھی آیا ہو۔ پھر آپ نے جو لطیفے شورش کاشمیری کی کہی ہوئی ہجو کے جواب میں سنائے، وہ شنیدنی اور بار بار شنیدنی تھے۔ لطف آ گیا۔ کتنا ظرف تھا اس شخص کا ''گالیاں کھا کے بدمزہ نہ ہوا''۔

مولانا کو سٹیج پر بیٹھے ہوئے ایک مخالف شیعہ عالم مناظر نے آپ کو دبانے کے لیے لاؤڈ سپیکر پر پوچھا عمر! ''سنی'' اور ''سور'' میں کیا فرق ہے۔ نہایت ٹھنڈے انداز میں اپنی طرف اشارہ کر کے فرمانے لگے یہ سنی ہے اور اس کی طرف اشارہ کر کے کہا ''یہ سور ایسا ہوا ہے۔ فرق اور فاصلہ خود ناپ لو''۔ ایک مناظرہ کے دوران ایک شیعہ مناظر نے بھرے مجمع میں مولانا اچھروی سے سوال کیا ''مولانا! مرغ سنی ہوتا ہے یا شیعہ''؟ آپ نے فرمایا: ''ٹوکرے کے نیچے ہو تو سنی، ٹوکرے سے باہر آ جائے تو مرغیوں کے جھگٹے میں ''شیعہ'' بنجاتا ہے اور متعہ کرتا چلا جاتا ہے''۔

مولانا مفتی شجاعت علی قادری مرحوم:

سنیوں کے بلند پایہ مفکر، عالم دین اور فقیہ ہوئے ہیں۔ وہ ترقی کرتے کرتے ''اسلامی مشاورتی کونسل پاکستان'' کے رکن بنے اور ملک کی اعلیٰ عدالتوں کے فقہی مسائل پر صف اول کے مشیر بنے، پھر وفاقی شرعی عدالت کے جج بنے۔ میں نے ''فتاویٰ رضویہ'' کی پانچویں جلد چھپوائی تو آپ نے اس پر ایک بھرپور دیباچہ لکھا جسے اہل علم و فضل نے بہت سراہا۔ ان کے فقہی مقالات عالم اسلام کے رسائل میں چھپتے اور پسند کیے جاتے تھے۔ ایک وقت آیا کہ وہ عالمی سطح پر منعقد ہونے والے سیمینارز میں شرکت کرنے کے لیے مختلف ممالک میں جاتے۔ ایسے ہی ایک سیمینار پر وہ انڈونیشیا گئے ہوئے تھے کہ سفر

میں ہی دل کا شدید دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔

مفتی شجاعت علی قادری مرحوم سے زیادہ شناسائی تو نہ تھی مگر ''بانی مرکزی مجلس رضا''، حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب مدظلہ العالی جب کبھی آپ کو لکھنے کے لیے کہتے تو نہایت خندہ پیشانی سے مجلس کے لیے لکھتے۔ آپ نے کبھی اپنے منصب، علم وفضل اور عالمی اعزازات کو حجاب نہیں بننے دیا۔ مجھے انہوں نے بتایا کہ جنرل ضیاء الحق کے دور اقتدار میں جب تدوین قوانین اسلام کے لیے علماء کرام کی آراء کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تو اسلامی حدود و تعزیرات پر کئی دنوں تک بحث چلتی رہی۔ حنفی فقہ میں چور کا سارا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے جب کہ شیعہ فقہ میں صرف انگلیوں کے پوٹے کاٹے جاتے ہیں۔ شیعہ حضرات کا اصرار تھا کہ تعزیرات کے سلسلہ میں اگر چار کی سزا شیعہ فقہ کی روشنی میں رکھی جائے تو حدود و تعزیرات کے تقاضے بھی پورے ہو جائیں گے اور لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ''مقطوع الید'' بھی نظر نہیں آئیں گے۔ مفتی شجاعت علی قادری نے ازراہ تفنن شیعہ علماء کو مخاطب کر کے فرمایا اگر آپ کی تجویز کو قانونی حیثیت مل گئی تو آپ لوگ بدنام ہو جائیں گے۔ کیونکہ سارے معاشرے میں جہاں کہیں انگلی کٹے لوگ نظر آئیں گے تو لوگ کہیں گے کہ پاکستان میں جتنے چور ہیں وہ سب ''شیعہ'' ہیں۔ ان کی انگلیاں کٹی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی سنی چوری کرتا تو اس کا ہاتھ کاٹا جاتا۔ شیعہ عالم دین نے کہا بات تو آپ کی درست ہے چلو اب اکثریتی فقہ پر ہی متفق ہو جاتے ہیں''۔

(''جہانِ رضا'' مارچ ۱۹۹۶ء)

علماء کرام کی یادیں

''خیابان سادات علی پور سیداں''، سیالکوٹ کے گل سرسبد صاحبزادہ سید علی اصغر شاہ علی پوری (رحمۃ اللہ علیہ) جب اپنے استاد مکرم مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقشبندی لاہوری کو ملنے آتے تو ان کے ساتھ ایک ابھرتا ہوا نوجوان نعت خوان بھی ہوتا تھا۔ اس نعت خوان کا نام ''محمد یوسف'' تھا۔ سادہ لوح نوجوان سادہ پنجابی میں نعت سناتا اور سادہ دلوں کو موہ لیتا۔ مولانا نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرشد زادہ کے اس نعت خوان سے بڑا پیار کرتے۔ پیرزادوں اور عام مہمانوں سے علیحدہ بلا کر اسے کچھ کھلاتے پلاتے اور جیب میں چاندی کے سکے بھی ڈال دیتے۔ اگرچہ صاحبزادہ علی حسین شاہ علی پوری، صاحبزادہ علی اکبر، صاحبزادہ علی اصغر علی پوری کے ساتھ ملک کے ایک نامور نعت خواں طوطی ہند محمد علی ٹرپّی مرحوم بھی ہوتے تھے مگر وہ عمر کے آخری دور میں تھے جب کہ محمد یوسف ابھی ابھرتا ہوا نوجوان تھا وہ طلبہ میں بیٹھ کر بلا تکلّف نعتیں سنا دیتا تھا۔ ہم محمد علی ٹرپّی کی نسبت محمد یوسف سے زیادہ مانوس تھے۔ محمد یوسف سیدھا سادہ دیہاتی نعت خوان تھا اور دیہاتی انداز میں نعتیں پڑھتا اور سناتا۔ کئی سال گزر گئے جب محمد یوسف پاکستان کے معروف نعت خوانوں کی صف اول میں کھڑے ہو کر ''محمد یوسف نگینہ'' کے نام سے ابھرا۔

''محمد یوسف نگینہ'' جس دینی جلسہ میں نعت پڑھتا، اہل درد کو لوٹ لیتا۔ لوگ اس کے انداز نعت خوانی کو بے حد پسند کرتے اور بے پناہ داد دیتے۔ عام نعت خوانوں کے رویے کے برعکس محمد یوسف نگینہ علمائے کرام کی تقریروں کو نہایت دلچسپی سے سنتا۔ ان کے علمی نکتوں کو ذہن نشین کرتا اور علماء کرام کی عوام میں بے پناہ مقبولیت دیکھ کر اس کا دل تڑپتا کہ کیوں نہ وہ بھی ایک عالم دین کی حیثیت سے عوام میں اپنا مقام پیدا

کرے۔ چنانچہ اس درویش نعت خوان نے دن رات کتابوں کا مطالعہ شروع [illegible] اردو کتابوں کے ساتھ ساتھ وہ عربی کتابوں کا مطالعہ بھی کرنے لگا۔ صرف مطالعہ [illegible] نہیں، تفاسیر واحادیث کی مستند اور بڑی بڑی کتابیں اس کے سامنے ہوتیں۔ [illegible] یاد نہیں، لیکن جب وہ پہلی بار حج پر گیا تو وہاں سے تفسیر روح المعانی، تفسیر روح البیان، تفسیر در منثور، ''تفسیر ابن عباس''، ''مواہب اللدنیہ'' اور نسیم الریاض جیسی بلند پایہ [illegible] کتابیں لایا۔ میں ملاقات کے لیے گیا تو ''آب زم زم'' اور ''مدینہ منورہ کی کھجوریں'' عنایت کرنے کی بجائے مجھے یہ علمی خزانے دکھا دکھا کر بے پناہ خوش نظر آیا۔

میں نے پوچھا آپ یہ بلند پایہ کتابیں کیا کریں گے؟ فرمایا: پڑھوں گا۔ میں [illegible] ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے کہا ''او یار پنجابی نعتیں سنایا کرو، [illegible] کتابیں اور یوسف نگینہ!'' پھر میں نے دیکھا کہ محمد یوسف نگینہ ان کتابوں کو پڑھنے [illegible] ڈوب کر مطالعہ کرنے لگا۔ علم وفضل سے اپنے شفاف سینہ کو مالا مال کرنے لگا۔ وہ [illegible] صرف کتابیں پڑھتا، بلکہ کتابیں کھاتا جاتا، ذہن نشین کرتا جاتا۔ مجھے یوسف نگینہ [illegible] بتایا کہ اس نے دو ہزار عربی کتابوں کا مطالعہ مکمل کر لیا ہے۔ اللہ اللہ! اور میں نے دیکھا ایک نعت خوان عالم دین بن گیا۔ خوش آواز تو تھا ہی، تقریر کرتا، اور میٹھے [illegible] شعروں کے ساتھ علمی نکتے پیش کرتا جاتا تو یوں محسوس ہوتا کہ موتی بکھیر رہا ہے۔ سامعین کے دل و دماغ پر علمی نگینے جڑ رہا ہے۔ اب وہ یوسف نگینہ نہیں تھا، ایک واعظ خوش بیان، ایک خطیب شیریں لسان اور ایک مقرر ذیشان کی حیثیت سے ملک کے گوشے گوشے میں خطاب کرنے جاتا۔

ایک زمانہ تھا میں ''فیصل آباد'' پہنچا۔ جہاں ایک ضلعی افسر کی حیثیت سے میری تعیناتی ہوئی۔ میں سرکاری رہائش گاہ کی بجائے شیخ الحدیث مولانا سردار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے دست راست مولانا عبدالقادر کے اس مکان میں رہنے لگا، جہاں آپ کو شہید کر دیا گیا تھا۔ یہ مکان مجھے سرکاری مکان کی نسبت اس لیے عزیز تھا کہ اس کے در و دیوار میں

[illegible] شہادت'' کی خوشبو سی بسی تھی۔ پھر درویشوں کا آنا جانا آزادانہ تھا اور میرے [illegible] احمد نوری ان درویشوں کی خدمت کرتے۔ ان دنوں جناح کالونی میں [illegible] مسجد'' کی تعمیر ہو رہی تھی۔ حضرت مولانا قبلہ الحاج محمد یوسف نگینہ اس مسجد [illegible] جاتے اور رات کسی امیر عقیدت مند کی کوٹھی کی بجائے میرے مکان میں [illegible] اور اپنی گفتگو میں اپنے علم وفضل سے مجھے بہت کچھ دیتے۔ وہ فیصل آباد [illegible] دن بھر اہل علم سے ملتے۔ ''صائم چشتی'' کے ڈیرے پر نعت پر گفتگو فرماتے۔ [illegible] رضویہ'' کے اساتذہ کے ساتھ علمی نکتے بیان کرتے۔ رات کو میرے چوبارے [illegible]۔ جب تک میں جاگتا، گفتگو کرتے۔ جب مجھے نیند دبوچ لیتی تو وہ کھڑے [illegible] پڑھنے لگتے۔ میں نیند کا متوالا جب کروٹ لیتا تو مولانا یوسف نگینہ نفل پڑھتے [illegible] ہچکیاں لے کر رہے ہوتے۔ اگرچہ مجھ جیسے غافل سرکاری افسر کو ان کے نوافل [illegible] سے کوئی سروکار نہ تھا۔ مگر مجھے رومی کا وہ شعر یاد آتا جو انہوں نے ''صحرائے [illegible]'' میں مجنوں کی شب بیداری اور آہ و زاری پر کہا تھا:

[illegible] نمایند نالۂ شبہائے تو — ذوقہا دارم ز ''یا رب ہائے'' تو!

[illegible] ناشتے پر بیٹھتے تو میں از رہ مذاق کہتا ''یوسف! تم نعت خواں تھے، پھر عالم بنے، [illegible] مقرر بنے۔ اب تم نے شب بیداری سے ولی اللہ بننا شروع کر دیا ہے۔ کہیں [illegible] ہاتھ سے نکل نہ جانا''۔ فرماتے نہیں آپ کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ ایسے لمبے [illegible] والے کو میں چھوڑ نہیں سکتا۔

صاحبزادہ میاں جمیل احمد شرقپوری نے قصور شہر میں ایک عظیم الشان جلسہ کا اہتمام [illegible] قصور کے لوگ اولیاء اللہ کی تربیت کی وجہ سے دینی محبت سے سرشار ہیں۔ میاں [illegible] احمد صاحب شرقپوری نے بھی قصور پر کافی توجہ دی۔ اس جلسہ میں میرے دوست [illegible] حسین صاحب ناظم، مولانا محمد بخش مسلم مرحوم اور دوسرے علماء کے علاوہ مولانا محمد [illegible] نگینہ بھی تھے۔ صاحبزادہ جمیل احمد صاحب مجھے بھی اس نورانی محفل میں لے

گئے۔ علمائے کرام نے بڑی زبردست تقریریں کیں۔ علماء کرام نے اہل جلسہ کو
بیانات سے خوش کر دیا۔ مولانا الحاج محمد یوسف نگینہ کی باری آئی تو آپ نے حضور
کریم ﷺ کو "عالم ماکان و ما یکون" ثابت کرنے کے لیے دلائل کے انبار لگا دیے
کتابوں کے حوالے، اہل علم کے نکتے، پھر معاندین کے اعتراضات کے جواب
انداز سے بیان کیے کہ اہل قصور کو "حضرت نگینہ" نے لوٹ لیا۔ اور لوگ عش عش کرا ٹھے۔

صبح ہوئی، ناشتا پر بیٹھے تو مولانا محمد بخش مسلم مرحوم، مولانا محمد یوسف نگینہ کو "چکر" دینا چاہتے تھے۔ فرمانے لگے حضرت رات آپ نے حضور کو "عالم ماکان و ما یکون" کہہ کر علمائے اہل سنت کے نظریے کی نفی کی ہے "ماکان و ما یکون" سے پہلے اور بعد کے علوم رسول کی نفی کر دی ہے۔ میں نے بھی مسلم صاحب کی تائید کی اور کہا:

"واقعی! کن فیکون تے کل دی گل اے اساں ہورا گیرے جانے ہاں"

پھر بشیر حسین ناظم صاحب نے "مولانا جامی" کے دو اشعار پڑھ کر ثابت کیا کہ "عالم ماکان و ما یکون" تو واقعی حضور کے علوم کے سمندروں کے سامنے ایک مقام ... مسلم صاحب نے مزید "علمی چکر" دیئے۔ مولانا محمد یوسف نگینہ مرحوم تو سیدھے سادے عالم تھے واعظ تھے۔ مناظرانہ اور منطقیانہ بھول بھلیوں سے آشنا نہ تھے۔ گھبرا گئے۔ ہم نے مزید گھیرا تنگ کیا تو مجلس سے اٹھ کر چلے گئے اور صاحبزادہ جمیل احمد صاحب شرقپوری کو علیحدگی میں کہنے لگے "یہ عجیب لوگ ہیں۔ رات سارا قصور عش عش کرا ٹھا۔ میرے ساتھی کہتے ہیں کہ میں نے حضور کے علوم کی نفی کی ہے"۔ یہ بات صرف مسلم مرحوم کی "چکر بازی" کی تھی۔ ورنہ یوسف نگینہ واقعی اہل علم و محبت میں "نگینہ" تھے۔

کچھ وقت اور گزرا تو آپ نے وعظ و بیان کی منزل سے آگے بڑھ کر بیعت طریقت کی وادی میں قدم رکھا۔ ہزاروں لوگوں کو گناہ کی وادیوں سے نکال کر شریعت کا پابند بنایا۔ سیکڑوں نوجوانوں کو طریقت و حقیقت کی راہوں سے آشنا کیا۔ وہ ایک عرصہ تک وسن پورہ لاہور کی جامع مسجد میں صوفی اللہ دتہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس خاص میں رہے۔

دونوں عقیدے کے پکے اور اپنے کام میں سچے تھے۔ ان دونوں حضرات کی علمی، افکاری اور روحانی خدمات نے ایک زمانے کو متاثر کیا۔

مجھے مولانا الحاج محمد یوسف نگینہ رحمۃ اللہ علیہ کے سارے نامور مریدوں کا تو علم نہیں مگر ہاں میں علامہ محمد منیر یوسفی ایم-اے نے اپنے پیرومرشد حضرت مولانا محمد یوسف نگینہ کی علمی اور روحانی جانشینی کا جوحق ادا کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نگینہ کی تربیت نے کیسے کیسے اہل علم و فضل تیار کیے ہیں۔ مولانا محمد یوسف فیصل آباد کے ایک گاؤں پیلے گھراں میں پیدا ہوئے۔ وہاں ہی آپ کا مزار مرجع خلائق ہے...... نور اللہ مرقدہ۔

ان کے سوانح حیات محمد محسن منور یوسفی صاحب نے "سیرت نگینہ رسول" عنوان سے قلم بند کیے ہیں۔ جبکہ ان کے مرید خاص مولانا منیر احمد یوسفی نے بھی ان کی سوانح عمری بعنوان "یوسف مصر محبت" چھاپ دی ہے۔ (مرتب)

مولانا محمد سعید نقشبندی، خطیب داتا گنج بخش (م:۸۶-۱۲-۱۷):

مولانا محمد سعید نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ سے اس وقت سے نیاز مندی رہی ہے جب وہ "دار العلوم محمدیہ رضویہ" بکھی شریف منڈی بہاء الدین سے حضرت سید حافظ حدیث سید جلال الدین شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ علم و فضل سے دستار فضیلت لے کر لاہور پہنچے۔ "جامع مسجد شاہ محمد غوث" بیرون دہلی دروازہ لاہور کے ایک حجرے میں آپ نے رہائش اختیار کی تو لاہور کے علماء کرام کا آنا جانا شروع ہوا۔

مولانا محمد سعید نقشبندی مرحوم خود بھی اہل علم و فضل سے ملاقاتیں کرتے اور ان کے خرمن علم سے خوشہ چینی کرتے۔ وہ ایک محنتی اور متجسس عالم دین تھے۔ جہاں سے علم کی کرن ملتی، اپنے سینۂ بے کینہ کو منور کرتے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ کچھ طلبہ ان کے ذاتی حلقہ میں بیٹھتے اور کتابیں پڑھتے مگر بعض اوقات باقاعدہ دینی مدارس کی مسند ارشاد پر بیٹھ کر اپنے علم کے پھولوں کو بکھیرتے۔ انہوں نے "حزب الاحناف"، جامعہ غوثیہ، نعیمیہ اور جامعہ نظامیہ سے بہت کچھ حاصل

کیا۔ پھر انہیں مدارس میں تدریسی خدمات سرانجام دیں۔ جب محکمہ اوقاف مساجد کو اپنی تحویل میں لیا تو وہ آہستہ آہستہ ترقی کرتے کرتے حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی جامع مسجد کے محراب و منبر کو اپنے خطابات سے آباد کرنے لگے۔ لاہور کی مسجد ایک روحانی اور مرکزی مسجد ہے، جہاں سامعین کو دعوت نہیں دینا پڑتی۔ لوگ بخود جوق در جوق چلے آتے ہیں۔ صرف ان حضرات کو سنبھالنا ضروری ہوتا ہے۔ مولانا محمد سعید نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مرکز کو مرکز علم و فضل بنا دیا۔ جمعہ کے خطبہ کے علاوہ آپ داتا کی مسجد میں ''درس قرآن'' دیتے۔ عصر کے بعد ''کشف المحجوب'' کا درس دیتے۔ پھر نقشبندی اور مجددی عالم دین ہونے کی حیثیت سے میانی شریف میں حضرت مجدد الف ثانی کے خلیفہ حضرت طاہر بندگی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر ''مکتوبات مجدد الف ثانی'' کا درس دیتے، جہاں مجددی حضرات باقاعدگی سے آتے۔

مولانا محمد سعید تدریسی و تعلیمی خدمات کے ساتھ ساتھ تالیف و تصنیف میں بڑی ہمت سے کام لیتے تھے۔ آپ نے مجددی ہونے کی نسبت سے ''مکتوبات امام ربانی'' فارسی اپنی نگرانی میں مکتبہ سلمان انارکلی لاہور سے شائع کرائے۔ پھر مکتوبات کا اردو ترجمہ کر کے ''مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی'' سے چھپوایا۔ یہ ترجمہ بے حد مقبول ہوا۔ امام غزالی کی کتاب ''کیمیائے سعادت'' اور ''منہاج العابدین'' کا ترجمہ کیا۔ ''مسلک امام ربانی'' جیسی بلند پایہ کتاب لکھی جس میں حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات اور نظریات کو مسخ کرنے والوں کا جواب تھا۔ آپ نے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''اشعۃ اللمعات'' کا اردو ترجمہ کیا۔ حضرت داتا گنج بخش کی جامع مسجد میں کئی علماء، فضلاء اور خطباء آئے مگر تمام کے تمام وعظ و نصیحت کی ''اپنی اپنی بولیاں بول کر'' اور دانا دنکا چن کر چلے گئے۔ صرف مولانا محمد سعید نقشبندی مرحوم وہ واحد خطیب اور عالم دین تھے، جنہوں نے اپنی علمی یادگاریں چھوڑیں اور اس مسند پر بیٹھ کر علمی فیضان کو عام کیا۔ حضرت داتا گنج بخش کی مسند کو آباد رکھا۔

مولانا محمد سعید نقشبندی مرحوم نے لاہور کی قدیم درسگاہ ''دارالعلوم نعمانیہ لاہور'' میں تدریس و تعلیم کی ذمہ داریاں قبول کیں اور اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ دارالعلوم نعمانیہ کو آباد رکھا اور کئی سال تک اس دارالعلوم کے ''شیخ الجامعہ'' کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ''دارالعلوم نعمانیہ'' کے علاوہ حضرت داتا گنج بخش کے مزار کے سامنے ایک درسگاہ قائم کی، جو آج تک قائم ہے اور آپ کا مزار اسی درسگاہ کے پہلو میں ہے۔ اب دربار کی توسیعات کی وجہ سے آپ کا مزار حضرت داتا گنج بخش کے مزار کے شمال میں منتقل کرایا گیا ہے۔

مولانا محمد سعید نقشبندی نے ''مجددی طریقت'' میں حضرت کیلیانوالہ شریف سے نسبت روحانیت حاصل کی۔ اور ایک مرید باصفا کی حیثیت سے اس درگاہ سے آخری دم تک وابستہ رہے۔ موجودہ دور کی مصروف زندگی اور دوڑ دھوپ کی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد سعید نقشبندی مرحوم کو بڑا سکون اور ثبات بخشا تھا۔ اور ان کی زبان و قلم سے دین کا بڑا کام لیا۔ آپ اپنے ہم عصر علماء میں سے تدریسی اور تالیفی میدان میں سبقت رکھتے ہیں۔ آج کے علمائے کرام خصوصاً ہمارے علمائے اہل سنت جتنی بڑی مسجد کے خطیب مقرر ہوتے ہیں، اتنے ہی بڑے غفلت شعار بن جاتے ہیں۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ علمائے کرام کی ایک گمنام ''انجمن غافلاں'' کے رکن ہیں۔ مگر مولانا سعید احمد نقشبندی مرحوم ایک مثالی خطیب، مدرس، معلم اور مصنف تھے۔ ان کا علمی مقام اور تالیفاتی کام اتنا اہم ہے کہ اس پر جس قدر ہدیۂ تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔ مگر بایں علم و فضل وہ مجھ سے بعض مسائل پر گفتگو کرتے، مشورہ لیتے مشورہ دیتے اور اس طرح وہ مجھ جیسے بے بضاعت فقیروں کو بھی اعتماد میں لیتے۔ یہ ان کی علمی عظمت کی دلیل ہے۔

(''جہانِ رضا'' جون، جولائی ۱۹۹۶ء)

علمائے کرام کی یادیں

تیس سال قبل لاہور کی دنیا بڑی پرسکون تھی۔ نہ آج کی طرح شور شرابا تھا نہ ذہنوں کی بے سکونی۔ لوگ دین کی بات بڑی محبت سے سنتے اور علماء کرام کا بے حد احترام کرتے تھے۔ میں اپنے استاد مکرم حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی مولف تفسیر نبوی کی جامع مسجد میں تقریر کیا کرتا تھا۔ میری تقریر میں عالمانہ باریکیاں تو نہ تھیں مگر مجھے یاد ہے کہ جب میں خوش آوازی سے شعر پڑھتا تو لوگ چلتے چلتے رک جاتے اور اس وقت تک رکے رہتے جب تک میری تقریر ختم نہ ہو جاتی۔

صدر المشائخ پیر فضل عثمان فاروقی:

دہلی دروازہ لاہور کے باہر جامع مسجد میں مجھے ''یومِ فاروقِ اعظم'' منانے کا شوق چرایا تو میں نے زبردست تیاریاں شروع کر دیں۔ میرے احباب ''یوم فاروق اعظم'' کو منفرد اور شایان شان طریقے سے منانا چاہتے تھے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ اس اجلاس کی صدارت کوئی ایسا فاروقی (روایتی نہیں) عالم دین یا بزرگ کرے جس کی تقریر سے حضرت فاروق اعظم کی یادیں تازہ ہو جائیں۔ ان دنوں افغانستان کے ایک بزرگ وہاں کی حکومت سے کبیدہ خاطر ہو کر پاکستان میں قیام پذیر تھے۔ ان کا اسم گرامی ''صدر المشائخ پیر فضل عثمان فاروقی مجددی'' (م: ۳-۱۹۷۳-۴-۱۰) تھا۔

میں حضرت مولانا ابو الحسنات قادری، خطیب جامع مسجد وزیر خان لاہور کی وساطت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ''یوم فاروق اعظم'' کی تیاریوں کا تذکرہ کیا ساتھ ہی اپنا ''رشتہ فاروقی'' بیان کیا تو آپ صدارت کے لیے مان گئے۔ یہ میرے لیے ایک بڑا اعزاز تھا۔ مولانا محمد بخش مسلم مرحوم اور مفتی محمد حسین صاحب نعیمی

اور مقررین میں سے تھے۔ مسجد کے فرش کو مخملین غالیچوں سے سجا دیا گیا اور چھت اور کی نقشوں سے بقعۂ نور بنا دیا گیا۔ میں نے صاحب صدر سے فارسی میں تقریر کرنے کی استدعا کی۔ خود مرصع فارسی میں سپاسنامہ تیار کیا اور سامعین کی صفوں پر عام لوگ کیں علماء کرام اور دانشور حضرات نورانی لباس میں جلوہ فرما تھے۔ حضرت پیر فضل عثمان فاروقی نے ''محفل فاروقیہ'' کے اس رنگ ڈھنگ کو دیکھا تو حضرت فاروق اعظم کی بارگاہ میں اس جوش اور ولولے سے ہدیۂ تحسین پیش کیا کہ سامعین جھوم جھوم رہے تھے۔ صدر المشائخ کے اس بیان کی چاشنی اور شیرینی کا سرور آج تک میرے دل و دماغ کو مسرور رکھے ہوئے ہے۔

صدر المشائخ پیر فضل عثمان مجددی فاروقی رحمۃ اللہ علیہ افغانستان کے ایک جلیل القدر عالم حضرت نور المشائخ مولانا فضل عمر عرف ملا شور بازار (۱۸۵۸-۱۹۵۶) کے فرزند ارجمند تھے۔ ملا شور بازار کابل کے خاندان مجددیہ کے نامور عالم دین تھے۔ جو افغانستان کی دینی اور سیاسی زندگی کے ہر پہلو پر گہری نظر رکھتے تھے۔ پیر فضل عثمان مجددی کابل کے ''مدرسہ مجددیہ'' کے تعلیم یافتہ تھے اور اپنے والد مکرم کی نسبت روحانی کی وجہ سے ''سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ معصومیہ'' کے ترجمان تھے۔

ہندوستان پر تسلط حاصل کرنے کے بعد جب انگریزوں نے افغانستان کو فتح کرنے کے لیے عسکری مہموں کا آغاز کیا۔ تو جن قوتوں نے انگریزوں کی مزاحمت کی ان میں جنوبی افغانستان کے ''تل'' کے مقام پر انگریزوں کے خونخوار دستوں کو شکست دینے والے مجاہدوں میں پیر فضل عثمان مجددی نے مجاہدانہ کردار ادا کیا تھا۔ جب ''بچہ سقہ'' نے غازی امیر امان اللہ خاں کے خلاف بغاوت کی تو پیر فضل عثمان مجددی جنرل غلام نبی کی قیادت میں بچہ سقہ کے لشکروں کے خلاف نبرد آزما رہے۔ بچہ سقہ کے گورنر عطاء محمد نے آپ کو گرفتار کر لیا اور ایک فوجی حکم کے ذریعہ سزائے موت کا اعلان کر دیا۔ ابھی آپ تختہ دار کے منتظر ہی تھے کہ جنرل غلام نبی نے زبردست حملہ کر کے مزار شریف، بلخ اور

ترکستان کے علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح آپ رہا ہو کر تاشقند چلے گئے۔ نادر شاہ نے بچہ سقہ کی حکومت کا تختہ الٹ کر پورے افغانستان پر اپنا اقتدار قائم کرلیا تو آپ کو کابل بلا کر وزارت انصاف (عدلیہ) کا رکن مقرر کردیا گیا۔

۱۹۴۸ء میں یہودیوں نے فلسطین کے مسلمانوں کو اپنے گھروں سے نکالنا شروع کیا تو صدر المشائخ نے اپنے والد کے ساتھ پورے افغانستان کا دورہ کیا اور لاکھوں روپے جمع کرکے مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی مرحوم کو پیش کرنے کے لیے خود بیت المقدس پہنچے۔

تحریک خلافت میں آپ نے مولانا محمد علی اور شوکت علی کے ساتھ دوسرے لیڈروں کو افغانستان کے دورے کی دعوت دی۔ آپ تحریک پاکستان کے زبردست حامی تھے اور جہاد کشمیر میں آپ کے مریدوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آپ کے مریدوں کا وسیع حلقہ افغانستان اور پاکستان کے علاوہ ہندوستان میں بمبئی، کلکتہ، کاٹھیاواڑ [illegible] مشرقی پاکستان میں پھیلا ہوا تھا۔ آپ نے اس وقت کے سیاسی حالات کے پیش نظر پاکستان اور افغانستان کو ایک متحدہ اسلامی قوت بنانے کا منصوبہ پیش کیا اور دوسرے اسلامی ممالک سے اتحاد کے لیے آواز بلند کی۔ پاکستان میں صدر المشائخ پیر فضل عثمان مجددی کی حسین شہید سہروردی، فیروز خان نون کی خارجہ وزارتوں نے بڑی پذیرائی کی اور اس وقت کی پاکستانی قیادت نے آپ کی خدمات کی قدر کی۔ آپ پہلے کراچی، پھر لاہور میں قیام فرما ہوئے۔

مجھے گلبرگ لاہور میں آپ کی قیام گاہ پر حاضری کا وقتاً فوقتاً موقع ملتا رہتا تھا [illegible] میں علماء کرام کا دامن پکڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو مجھے ''یوم فاروق اعظم'' کی رونق کے حوالے سے قریب بٹھاتے۔ صدر ایوب کے زمانہ اقتدار تک آپ کی محفل علماء، مشائخ، سیاست دانوں اور عقیدت مندوں سے بھری رہتی تھی۔ ایوب خان بھی آپ کی خدمات کا مداح تھا۔

آپ ۱۸ اپریل ۱۹۷۳ء کو لاہور میں فوت ہوئے اور ایک خصوصی چارٹرڈ طیارے [illegible] آپ کے جسد خاکی کو کابل پہنچایا گیا۔ اس طیارے میں آپ کے خانوادے [illegible] افراد کے علاوہ مرکزی مجلس رضا کے بانی حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری اور [illegible] پیر جمیل احمد صاحب شرقپوری بھی کابل پہنچے اور آپ کو خانقاہ عالیہ مجددیہ قلعہ [illegible] دفن کردیا گیا۔

[illegible] فضل عثمان مجددی کی شفقت سے مجھے جو حصہ ملا تھا اس کی وجہ سے آپ کے [illegible] فضل الرحمان مجددی رحمۃ اللہ علیہ بھی مجھے نگاہ التفات سے دیکھتے تھے اور جب [illegible] افغانستان کے عظیم سیاسی راہنما سابق صدر سلطنت افغانستان پروفیسر صبغۃ اللہ [illegible] سے ملاقات کا موقع ملا تو انہوں نے بھی آپ کے تذکرہ سے نوازتے ہوئے [illegible] کی واقعات سنائے۔

مولوی نور محمد ایمن آبادی:

عالم نہیں تھا نہ مدرسہ میں پڑھا نہ مکتب سے کچھ سیکھا۔ وہ ایمن آباد کا سنار (زرگر) تھا۔ اور اپنے فن میں یکتا تھا وہ سونے چاندی کے زیورات کی تراش خراش [illegible] نئی نویلی دلہنوں کو چار چاند لگا دیا کرتا تھا۔ اس خوبصورت فن کے ساتھ ساتھ اسے علماء کرام کی تقریریں سننے کا بہت شوق تھا۔ جہاں کوئی واعظ شیریں بیان آتا، مولوی نور محمد ایمن آبادی صف اول میں بیٹھا دکھائی دیتا۔ جہاں کوئی عالم خوش کلام تقریر کرتا، مولوی نور محمد ایمن آبادی سارا کام چھوڑ چھاڑ کر اس کے سامنے ہوتا۔ تقریریں سن کر گھر آتا۔ زیورات بناتا تو علمائے کرام کی تقریروں میں سنے ہوئے میٹھے شعروں کو اپنی میٹھی طرز میں دہراتا۔ اپنے دل کو خوش کرتا اور سننے والوں کو بھی موہ لیتا۔ علماء کرام کی تقریریں سننے کے ذوق نے اسے یہاں تک پہنچا دیا کہ کئی نویلی سجیلی دلہنیں زیور کے [illegible] ڈولی میں بیٹھ کر روتی روتی پیا کے گھر چلی جاتیں۔

ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر چیکاں مینوں لے چلے بابلا لے چلے وے!

کئی بابل تو اپنی ہیر جیسی بیٹیوں کو زیورات کے بغیر ہی ڈولی میں ڈال کر [illegible] نور محمد ایمن آبادی کو کوستے۔ جو دوسرے دن ان بابلوں کی گالیاں سننے سے پہلے ان علماء کرام سے سنے ہوئے اشعار سنا دیتا جن کی تقریروں کے عشق میں اس [illegible] دلہنوں کو زیور کے بغیر ہی سسرال بھیج دیا تھا۔

مولوی نور محمد ایمن آبادی ایک عرصہ تک خوش بیان علمائے کرام کی تقریروں [illegible] درد اور اپنی خوش آوازی کے ذوق کو اپنے سینہ میں پالتا رہا۔ مگر ایک دن ایک مجلس [illegible] سے واپس آیا تو اس کا جوان سال بیٹا سڑک کے ایک حادثہ کا شکار ہو کر خون میں [illegible] پت پڑا تھا۔ مولوی نور محمد ایمن آبادی نے اسے دیکھا تو اس کا سینہ پھٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی نہریں ابل پڑیں۔ وہ پاگل ہو گیا۔ دیوانہ ہو گیا کہتے [illegible] ایک عرصہ تک وہ جوان بیٹے کی یاد میں دردناک شعر پڑھتا رہا:

؎ سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق　　تا بہ گویم، شرحِ دردِ اشتیاق

''وہ کئی سال تک اپنے گم کردہ فرزند کا ماتم کرتا رہا۔ وادی و صحرا کو درد دیتا رہا۔ کوچہ و بازار کو رلاتا رہا۔ جو بھی اس کی دردناک کہانی سنتا، تڑپ اٹھتا''۔

؎ من بہر جمعیتے نالاں شدم　　جفت بدحالاں و خوش حالاں شدم

''کسی ولی اللہ نے اس کے دردمند سینے پر ہاتھ پھیرا تو اسے سکون قلب ملا۔ اب وہ زرگری چھوڑ کر لوگوں کو واقعات درد سے دمساز بناتا''۔

ایک وقت تھا کہ لاہور کے باغات میں بڑے بڑے بلند پایہ علمائے کرام اپنے وعظ و بیان سے لاہور کے لوگوں کو خوش کرتے۔ خصوصاً شاہ عالمی دروازے سے لے کر بھاٹی دروازہ تک کے باغات علماء کرام کی تقریروں سے گونجتے اور سامعین کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے۔ ان دنوں لاہور کے باغ آج کل کی آلائشوں اور تجاوزات سے محفوظ تھے۔ خوش گوار سبز گھاس اور ٹھنڈے درختوں کے سائے اہل محبت کی درگاہیں تھیں۔ لاہور سے ہٹ کر اب دوسرے شہروں کے لوگ بھی ان جلسوں میں

آنے لگے۔ میں نے ان باغوں میں صاحبزادہ سید فیض الحسن آلومہاروی کے بیان کی [illegible] سنیں۔ میں نے ان باغوں میں مولانا محمد بخش مسلم بی۔ اے کی انگریزی کے [illegible] سے مزین اردو تقریریں سنیں۔ میں نے ان باغوں میں مولانا محمد عمر اچھروی کو [illegible] باندھتے دیکھا۔ میں نے ان باغوں میں اپنے دوست مولانا محمد شریف نوری کی [illegible] آوازی کو سنا۔ میں نے ان باغوں میں مولانا غلام محمد ترنم اور مولانا غلام دین ([illegible] شہید) کو مجمعوں پر چھائے دیکھا۔ اللہ ان علمائے کرام کی قبروں کو نور سے بھرپور کرے (نور اللہ مرقدہم) ان کی تقریروں کو سن کر لوگ اپنا آپ بھلا جاتے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں ان باغوں میں ڈیرے ڈالے پڑے رہتے تھے۔

مولوی نور محمد ایمن آبادی ان علمائے کرام کے سٹیج پر تو نہ آتے مگر بھاٹی دروازے کے مغربی باغ میں اپنی مسند وعظ بچھاتے اور گھنٹوں بیان کرتے۔ ان کے سامعین پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ جب چاہیں، آئیں اور جب چاہیں چلے جائیں۔ جس طرح چاہیں بیٹھیں، جس طرح چاہیں لیٹیں مگر مولوی نور محمد ایمن آبادی اپنے بیان اور خطاب کو جاری رکھتے۔ یہ فری لانسر مجمع اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد مجمع ہوتا تھا۔ مستورات زیادہ ہوتیں۔ لاہور کی یہ خواتین بلا تکلف چادریں اوڑھے آتیں، وعظ سنتیں۔ انہیں وعظ کے دوران گھر کے لیے سبزیاں بنانے، سویٹر بننے، سوتر کی الجھنیں دور کرنے، حتیٰ کہ بچوں کو دودھ پلانے کی کھلی آزادی تھی۔ مولوی نور محمد ایمن آبادی اپنی میٹھی آواز میں ''ہرنی کا قصہ'' سناتے۔ ''جابر کے فرزندوں کی قربانی'' کے واقعات سناتے۔ مدینہ کے سفر پر جانے والے کبوتروں کی اڑانوں پر روشنی ڈالتے۔ حضرت بلال کے درد کو اپنی درد بھری تقریر میں شامل کرتے۔ حضرت اویس قرنی کے عشق کو اپنی تقریر کا موضوع بناتے اور جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے بیٹے حضرت یوسف کے فراق میں تڑپنے کا بیان کرتے تو انہیں اپنا جوان بیٹا یاد آ جاتا تو مجمع کو رلا دیتے۔

ایک ایسا دور آیا کہ پاکستان میں ''اسلامی سوشل ازم'' کا دور دورہ ہوا۔ ذوالفقار

علی بھٹو نے بڑے بڑے کارخانے نیشنلائز کر لیے۔ بڑی بڑی ملیں پیپلز پارٹی کے جیالوں کے قبضے میں آگئیں۔ کل کے کنگلے آج کے رئیس بن گئے۔ یہ وبا اس قدر عام ہوگئی کہ منڈیاں اور بازار تک نیشنلائز ہونے لگے۔ مولوی ایمن آبادی کے ایک عزیز کی دکان پر جیالوں نے یہ کہہ کر قبضہ کرلیا کہ یہ زرگر ہے، سنار ہے، زرفروش ہے اور سونے کا ذخیرہ اندوز ہے۔ اس بات نے مولوی نور محمد ایمن آبادی کی طبیعت پر بھی اثر ڈالا۔ وہ کھلے بندوں اس ظلم کے خلاف آواز تو نہ اٹھا سکتے تھے مگر ان کے پاس ایک ایسا فورم تھا جس پر کھڑے ہوکر اپنا مدعا بیان کر سکتے تھے۔ وہ بھاٹی دروازے کے باہر میں بڑے درد سے کہتے:

گھگی بیٹھی وچہ وظیفے لٹ کھادا گھر کانواں!

وہ اس شعر کی یوں وضاحت فرماتے گھگی (فاختہ) سے مراد پاکستانی بے بس عوام ہیں جو بے بسی کے عالم (وظیفے) میں بیٹھتے ہیں اور کووں (پیپلز پارٹی کے شکروں) نے ملک کو لوٹ لیا ہے۔ مولوی نور محمد ایمن آبادی اس موضوع کی وضاحت کرتے تو حاضرین کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ وہ فاختہ، کوّں اور وظیفے کی بڑے لطیف انداز میں وضاحت کرتے۔ اس مصرع کو وہ کئی کئی بار سناتے اور ہر بات پر نئی تشریح فرماتے۔ جب وہ دوسرا مصرع پڑھتے کہ

باز عقاب اڈن جس ویلے پُت نہ سانبھن ماواں!

ان ظالمانہ حالات کے ردعمل میں جب ''باز اور'' عقاب'' پرواز کریں گے تو مائیں اپنے جگر گوشوں کو بھول جائیں گی۔ مولوی نور محمد ایمن آبادی کی آواز سن کر مجمع میں بیٹھی ہوئی عورتیں اپنے بچوں کو سینے سے بھینچ لیتیں اور کہتیں ''دیکھو مولوی باز اور عقاب اڑا رہا ہے''۔ مولوی نور محمد ایمن آبادی کے یہ اشعار تو درد والم کی داستان کو پیش کر رہے تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ چند دنوں بعد جنرل ضیاء الحق بڑی بڑی مونچھیں سجائے ''باز'' اور ''عقاب'' بن کر ٹیلی ویژن پر آئے تو واقعی جیالوں کی مائیں اپنے

اولاد کو بھی نہ سنبھال سکیں۔

مولوی نور محمد ایمن آبادی کی درد بھری آواز اور خوش آوازی نے شاید ان کے غم [illegible] ہوں یا نہیں مگر وہ عوام میں درد وغم بکھیرتے گئے اور ساری عمر اہل درد کو ہمدرد [illegible] رہے۔ ان کی میٹھی آواز کو ریڈیو کے ایک افسر نے سنا تو مولوی نور محمد ایمن آبادی کو ریڈیو پاکستان لے گیا۔ وہ ایک عرصہ تک ریڈیو پاکستان سے بھی اپنے درد [illegible] بھرے نغمے فضا میں بکھیرتے رہے۔ (برد اللہ مرقدہ)

(''جہانِ رضا''، ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۶ء)

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ

صاحبِ تفسیر نبوی (م: ۱۹۴۴ء)

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ لاہور کے ان علماء کرام میں ہوتے ہیں جنہوں نے بیسویں صدی عیسوی میں دینی اور اسلامی اقدار کی نشوونما بھرپور حصہ لیا اور ساری زندگی علم وعرفان کی خدمت میں صرف کر دی۔ آپ لا کے قدیم آرائیں خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ شہری اور زرعی جائیداد کے مالک تھے۔ والد کا اسم گرامی میاں محمد وارث تھا۔ آپ کا سنہ ولادت ۱۸۵۰ء ہے مگر تذ علمائے اہلسنت لاہور میں آپ کا سنہ ولادت ۱۸۶۰ لکھا ہے اور آپ کا سنہ وصال ۱۹۴۴ء ہے۔ آپ کے والد میاں محمد وارث اپنے والد مکرم میاں الٰہی بخش المعر میاں بالیا کی زرعی زمینوں کے نگران تھے۔ ان زمینوں میں کھیتی باڑی کے لیے حضر مولف علام کے بڑے بھائی میاں قادر بخش ہی اپنے والد کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

آپ کا آبائی گھر اور جائے پیدائش اکبری منڈی اندرون دہلی دروازہ میں تک اصلی حالت میں موجود ہے۔ یہ محلہ لاہور کے آرائیں خاندانوں کا مشہور محلہ مو کہلاتا تھا جہاں آرائیں قبیلے کے اشراف قیام پذیر تھے۔

آپ کے والدین نے آپ کو اپنے محلہ میں ایک ''حلوائی'' کی شاگردی میں دے دیا، جہاں آپ نے اپنی ابتدائی زندگی کا قیمتی حصہ گزارا، اور اپنے استاد گرامی کی نگرانی میں حلوائی اور حلوہ سازی کے تمام امور میں مہارت حاصل کی۔ مولانا حلوائی کے استاد گرامی بڑے نیک سیرت اور صالح آدمی تھے۔ انہوں نے اپنے شاگرد رشید اجازت دے رکھی تھی کہ وہ کام کے ساتھ ساتھ قریبی مسجد میں قرآن مجید پڑھیں

جب آپ قرآن مجید ناظرہ ختم کر چکے تو ایک دینی مکتب میں ابتدائی کتابیں پڑھنے کی اجازت دی۔ آپ حلوائی کی دکان میں اپنے کام کے ساتھ ساتھ مکتب عربیہ میں بڑی سے اسباق پر عبور حاصل کرتے گئے اور ابتدائی صرف ونحو اور دوسری دینی کتابوں کو ازبر کرتے گئے۔

حاصل مؤلف مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ سن شعور کو پہنچے تو آپ نے اپنے کے قریب ہی تکیہ سادھواں کے ''مدرسہ غوثیہ'' میں دینی کتابوں کی تعلیم حاصل کرنا کی۔ اس مدرسہ کے ناظم ومہتمم کشمیر کے ایک بزرگ پیر عبدالغفار شاہ قادری کشمیری رحمۃ اللہ علیہ تھے، جو شیخ طریقت بھی تھے اور معلم علوم دینیہ بھی تھے۔ مولانا حلوائی اس مدرسہ میں دینی علوم کے مختلف مراحل طے کیے اور ساتھ ساتھ اپنے استاد مکرم عبدالغفار شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی مجالس میں بھی شریک ہو کر عرفان وتصوف ابتدائی رموز سے واقفیت حاصل کی۔

علامہ حلوائی سرخ وسفید رنگت کے مالک تھے، میانہ قد اور خوبصورت متوازن سے متصف تھے۔ آپ لاہور کے آرائیں خانوادہ کا معروف لباس زیب تن تے اور مروجہ عالمانہ جبہ ودستار سے اجتناب فرماتے۔ آپ کے سر پر عمامہ سجتا، کے نیچے سفید ٹوپی ہوتی اور بدن پر کھلے گلے اور ڈھیلے بازوؤں والی سفید قمیص ۔ جسے آج کے الفاظ میں کھلا کرتہ کہا جا سکتا ہے، لباس سفید براق ہوتا۔ کھدر اور کے لباس کو زیادہ ترجیح دیتے۔ آپ اپنے پاؤں میں ''گامے شاہی'' جوتا جو سرخ سے بنا ہوتا پہنتے۔ بڑھاپے میں ریش مبارک کو رنگ حنا سے مزین فرماتے مگر کے آخری ایام میں ریش حنائی کی بجائے چہرے پر سفید داڑھی سجنے لگی۔

اپنی عادات واطوار کے لحاظ سے حضرت علامہ حلوائی رحمۃ اللہ علیہ لاہور کی ایک مقتدر کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ وہ عام علماء کرام کی بود وباش کر ایک کارکن اور کاسب کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے۔ دن بھر کام

کرتے، رات علماء اور صوفیہ کی مجالس میں بیٹھتے۔ اس طرح آپ ''ہم دنیا و ہم
کی مصروفیتوں میں مصروف رہتے۔ آپ اپنے ہمعصر علماء میں ممتاز عالم دین کی
حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ عمر کے آخری پندرہ سال آپ نے اپنا کاروبار
کر کے صرف اور صرف دینی اور علمی مشاغل کو اپنا لیا تھا۔ اپنی شبانہ روز محنت سے
کی کمائی ہوئی دولت سے دہلی دروازے کے باہر کوتوالی کی شمالی دیوار کے ساتھ ایک
منزلہ مسجد بنائی جس کے پہلو میں حجرے تعمیر کروائے، جنوبی حجروں میں آپ کے شا
رہتے تھے اور شمالی حجروں میں آپ زندگی کے آخری ایام تک بذاتِ خود رہائش پذ
رہے اور آپ کا شعبہ تصنیف و تالیف انہیں حجروں میں قائم تھا۔ یہ دو منزلہ مسجد آ
کے شاگردوں اور زیرِ تربیت سالکوں سے ہمیشہ آباد رہتی تھی۔ آپ وقت کے جید علما
دین کے پاس خود جاتے، دینی حلقوں میں حاضری دیتے، اگر کوئی شیخِ طریقت آ
ہمہ تن ادب بن کر ان کی مجلس میں حاضری دیتے۔

آپ کا یہ معمول تھا کہ نمازِ جمعہ کے بعد اپنی مسجد میں بیٹھ جاتے، احباب کی محفل
ہوتی، لوگ مختلف مسائل پر گفتگو کرتے اور آپ ان پر روشنی ڈالتے۔ آپ کی محفل میں
خصوصی طور پر اعتقادی معاملات پر گفتگو ہوتی اور آپ اہلسنّت و جماعت کا نقطۂ نظر
کرتے اور لوگوں کی اعتقادی صورت حال کی اصلاح کے لیے بڑی دلچسپی لیتے تھے۔

آپ اپنے وقت کے جید عالمِ دین اور امامِ اجل تھے۔ بدعقیدہ علماء کے پراپیگنڈ
کا جواب دیتے۔ معاندین کی تحریروں کا جواب تحریر سے دیتے۔ ان کی کتابوں کا
کتابوں سے کرتے۔ آپ نے غیر مقلد عالم دین حافظ محمد لکھنوی کی ''تفسیر محمدی'' کی
راہ رویوں اور بداعتقادیوں کو اپنی ''تفسیرِ نبوی'' کے علمی مباحث سے رد کیا۔

آپ کی روحانی زندگی کا ایک معمول یہ بھی تھا کہ آپ سحری کے وقت نمازِ تہ
سے فارغ ہو کر صبح کی نماز تک مسجد کے فرش پر بیٹھ کر بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں درو
شریف کا نذرانہ پیش کرتے۔ صبح ہوتی تو اپنے شاگردوں کے حلقہ میں بیٹھ کر ہزاروں

درود پاک پڑھتے اور پڑھاتے۔ پھر تلاوت قرآن پاک اور دوسری کتابوں کی
تدریس فرماتے۔ آپ کے تلامذہ، شاگرد اور مسجد کے نمازی آپ کے ان معمولات
سے استفادہ کرتے۔ دن بھر تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے اور نماز ظہر کے بعد عام
لوگوں میں بیٹھ کر مسائل دینیہ پر گفتگو فرماتے۔ نمازِ عصر کے بعد چند مخصوص احباب
کے ساتھ بیٹھ کر ختم خواجگان پڑھتے۔ ختم خواجگان میں سترہ آدمیوں سے زیادہ آدمی
شرکت نہیں کیا کرتے تھے اور آپ کا یہ معمول زندگی بھر رہا۔ آپ نے حلوائی کی
دکانداری میں زندگی کا اکثر حصہ بسر کیا۔ دودھ دہی کی تیاری کے علاوہ آپ حلوہ کا
خصوصی دیگچہ تیار کرتے جس سے دور دور سے آنے والے گاہک اپنا حصہ لیتے۔ ان
گاہکوں میں سے اکثر ایسے حضرات بھی تھے جو حلوہ کھانے کے ساتھ ساتھ آپ سے
دینی مسائل کا حل بھی دریافت کرتے تھے۔

آپ کے تذکرہ نویسوں نے مدرسہ غوثیہ پیر عبدالغفار شاہ قادری الکاشمیری رحمۃ اللہ علیہ
کے علاوہ آپ کو مدرسہ فتحیہ اچھرہ کا شاگرد بھی بتایا ہے اور آپ کے اساتذہ میں مولانا
غلام قادر بھیروی خطیب بیگم شاہی مسجد، مولانا معوان حسین خطیب بادشاہی مسجد، مولانا
غلام دستگیر قصوری خلیفہ خواجہ غلام محی الدین قصوری دائم الحضوری اور دوسرے علماء کے نام
لکھے ہیں۔ مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ آپ کے نہ صرف استاد بلکہ پیر و مرشد بھی
تھے۔ ان اہلِ علم کے علاوہ آپ نے دوسرے سنی معاصر علماء سے بھی اکتسابِ علم کیا۔

آپ ساری زندگی بدعقیدہ علماء سے برسرِ پیکار رہے مگر علمائے اہلسنّت و جماعت
سے کبھی اختلاف نہیں کیا اور آپ ہمیشہ عام سنیوں سے بھی محبت اور شفقت سے پیش
آتے۔ وہ رافضی، قادیانی، وہابی، دیوبندی، نیچری اور دوسرے بدعقیدہ علماء پر تنقید
کرتے رہتے اور اپنے عقیدہ کی اشاعت میں سرگرم رہتے۔ وہ عقیدہ میں متزلزل اور
مخالف عقائد کی مجالس میں حصہ لینے والے سنی علماء کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور انہیں
مذبذبین کہا کرتے۔ آپ غربا، مساکین، طلبہ اور یتامیٰ پر ہمیشہ مہربانی فرماتے اور

اپنی شب و روز کی کمائی کا زیادہ حصہ ایسے لوگوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔
آپ کا مدرسہ بے سہارا طلبہ، یتیموں و مساکین کے لیے جائے پناہ تھا۔ یہاں
انہیں طعام و قیام کے علاوہ شفقت و محبت کی دولت بھی ملتی تھی۔

آپ زندگی کے ستر (۷۰) سال مکمل کر چکے تو آپ کی نگاہ کمزور ہوگئی۔ پھر
میں تکلیف ہوگئی جس کی وجہ سے آپ یکم نومبر ۱۹۴۴ء مطابق ۱۴ ذیقعدہ ۱۳۶۳ھ
واصل بحق ہوئے اور اپنی مسجد کے ایک حجرے میں ہی آسودہ خاک ہوئے۔

شدیم خاک و لیکن ز بوئے تربت ما
تواں شناخت کہ زیں خاک مردمی خیزد

آپ کا مزار مبارک آج بھی مرجع علماء و اساتذہ ہے۔

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقشبندی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے کاروبار زندگی کے ساتھ ساتھ علوم متداولہ دینیہ کے حصول کے لیے بڑی محنت کی اور لاہور کی معروف دینی درسگاہوں کے قابل اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کر کے مختلف اصناف علوم پر عبور حاصل کیا۔ آپ نے عربی میں علم صرف، نحو، منطق، معانی، فقہ، اصول تجوید میں مہارت حاصل کرنے کے بعد احادیث نبوی اور تفاسیر قرآن پاک کا وسیع مطالعہ کیا۔ آپ کے استاد مکرم مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم نعمانیہ لاہور کے بانی اساتذہ میں سے تھے۔ اس لیے آپ نے دارالعلوم نعمانیہ لاہور سے علم حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم فتحیہ اچھرہ میں داخلہ لیا۔ اگرچہ ہمیں آپ کے تمام اساتذہ کے اسمائے گرامی نہیں ملے تاہم آپ کی تحریروں میں پیر عبدالغفار شاہ قادری کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ مہتمم مدرسہ غوثیہ تکیہ سادھواں اندرون کشمیری بازار لاہور کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ انہی دنوں انجمن نعمانیہ لاہور نے موچی دروازہ کے اندر جامع مسجد بکن خان لاہور اور عالمگیری مسجد لاہور میں دینی مدارس قائم کیے تو مولانا ''حلوائی'' مسجد بکن خان کے مدرسہ میں بھی زیر تعلیم رہے۔ یہ انجمن نعمانیہ کے دارالعلوم کا وہ شعبہ

ہو جہاں حضرت پیر حافظ جماعت علی شاہ علی پوری رحمۃ اللہ علیہ اور پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی بھی زیر تعلیم رہے۔ دارالعلوم غوثیہ مسجد تکیہ سادھواں لاہور میں حضرت مولانا حلوائی جنوری ۱۹۱۵ء میں زیر تعلیم تھے۔ ان دنوں وہاں وقت کے جلیل القدر معلم اور فرائض تدریس سرانجام دے رہے تھے۔ مولانا احمد علی بٹالوی، مولانا نور بخش (کی)، مولانا اصغر علی روحی، مولانا تاج الدین قادری، مولانا محمد الشاہ میر الواعظ جیسے اساتذہ کے اسمائے گرامی ملتے ہیں۔ آپ نے اس دارالعلوم کی تعریف میں اپنی مشہور کتاب ''شفاء القلوب فی الذکر المحبوب'' میں ایک طویل نظم لکھی ہے۔

کشمیروں تشریف لیایا وچ لاہور شہر دے
اہلسنّت نوں خوشیاں ہویاں بنے غلام نظر دے

رستے پاون والا آیا نور کھنڈاون والا
''عبد غفار'' ہے ناتواں روشن رب ملاون والا

لطف عنایت رب دی ہوئی مینوں عبد غفاروں
میرے اوپر کرم کماندے نال ہزار پیاروں

میں بھی عاجز اوسے در دا عاجز اک گدائی
''نبی بخش'' ہے ناتواں میرا المشہور ''حلوائی''

دل جانوں شاگرد اینہاں دا عاجز ہے حلوائی
صاحبزادہ اک حضرت دا ہے اوہ بھی صالح بھائی

مولانا غلام قادری بھیروی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۹۰۹-۴-۱۰):

مولانا غلام قادر بھیروی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے نامور اساتذہ میں سے تھے۔ آپ بھیرہ (سرگودھا) میں ۱۲۶۵ء کو پیدا ہوئے۔ آپ لاہور آئے تو مولانا غلام محی الدین بگوی

اور مولانا احمد دین بگوی کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی چلے گئے جہاں آپ نے مولانا صدر الدین آزردہ کے دار العلوم سے تکمیل علوم کی۔ لاہور میں آپ اورینٹل کالج میں عربی استاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور ۱۸۹۷ء تک اورینٹل کالج میں پڑھاتے رہے۔

حضرت مولانا غلام قادر بھیروی رحمۃ اللہ علیہ روحانی طور پر سلسلہ چشتیہ سیالویہ میں خواجہ شمس الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ آپ بڑے راسخ العقیدہ سنی عالم دین تھے۔ عقیدہ کے معاملہ میں کسی سے رورعایت نہیں برتتے تھے۔ آپ نہ غلط فتویٰ دیتے اور نہ بداعتقادی پر کسی قسم کی رعایت برتتے تھے۔ انہوں نے اورینٹل کالج سے صرف اس بات پر استعفاد ے دیا تھا کہ انگریز کے کہنے پر غیر اسلامی معاملات پر وہ جواز کا فتویٰ نہیں دیں گے۔ آپ اورینٹل کالج سے مستعفی ہونے کے بعد دار العلوم نعمانیہ میں استاد مقرر ہوئے، پھر بیگم شاہی مسجد لاہور میں مستقل خطیب اور نگران مقرر ہو گئے۔

حضرت مولانا بھیروی رحمۃ اللہ علیہ تدریس و خطابت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف میں بھی مشغول رہے۔ آپ نے اسلام کی دس جلدوں کے علاوہ شمس الضحیٰ، عکازہ اشراق الصمدیہ، النور الربانی، جوہر ایمانی، شمس الحنفیہ جیسی بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں۔ آپ سے ہمارے مؤلف علام مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ نے علمی اور اعتقادی طور پر بھرپور استفادہ کیا۔ آپ نے ۱۳۲۸ھ میں وصال فرمایا۔ آپ کے ایک اور شاگرد مولانا محمد عالم آسی امرتسری نے ''در خلد بریں رفت قبلہ من'' سے تاریخ وفات نکالی ہے۔

مولانا غلام محمد بگوی (م: ۱۹۰۰-۹-۳۰):

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی کے جلیل القدر اساتذہ میں سے مفتی غلام محمد بگوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مولانا بگوی انجمن اسلامیہ لاہور کے زیر اہتمام آنے کے بعد عالمگیری شاہی مسجد لاہور کے پہلے خطیب تھے۔ آپ نے اس شاندار مسجد کو علم وفضل کا مرکز بنا دیا اور شبانہ روز محنت سے نصف صدی بند رہنے والی مسجد کو آباد

اور رونق و شباب تازہ سے ہمکنار کر دیا۔ آپ لاہور کے قدیم اساتذہ میں سے تھے۔ آپ کے حلقۂ تدریس سے مولانا محمد نبی بخش حلوائی کے علاوہ مولانا غلام قادر بھیروی، مولانا محمد ذاکر بگوی، پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور، مولانا محمد عالم آسی امرتسری، مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ جیسے برگزیدہ علمائے کرام خوشہ چینی کرتے رہے۔ آپ کے دو عالم و فاضل بیٹے مولانا محمد رفیق بگوی اور مولانا محمد شفیق بگوی خطیب شاہی مسجد لاہور صدقہ جاریہ کی حیثیت سے ایک عرصہ تک دینی علوم کی اشاعت میں مصروف رہے۔

مولانا معوان حسین مجددی:

پنجاب کے ان علمائے کرام کے علاوہ رامپور (ہندوستان) کے علمی اور روحانی خانوادہ کے ایک عالم دین حضرت مولانا معوان حسین رامپوری خطیب شاہی مسجد لاہور، لاہور میں تشریف لائے تو فاضل مؤلف مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی شاگردی بھی اختیار کی۔ مولانا معوان حسین رامپوری رحمۃ اللہ علیہ مولانا ارشاد حسین رامپوری رحمۃ اللہ علیہ کے نامور فرزند تھے۔ ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے، اپنے گرامی قدر والد سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا سلامت اللہ رامپوری اور مولانا عبدالغفار خان رامپوری سے مروجہ علوم میں تکمیل کی۔ مولانا معوان حسین رامپوری اپنے والد کے علاوہ مولانا عنایت اللہ خان سے بیعت تھے۔ آپ نے مدرسہ ''الارشادیہ'' کے نام سے ایک تدریسی شعبہ قائم کیا جو سیکڑوں طلبائے علم کی تشنگی کا سامان بنا۔ مولانا معوان حسین رامپوری رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم نعمانیہ لاہور جو ان دنوں شاہی مسجد میں قائم تھا، کے سالانہ جلسہ میں تقریر کرنے آئے تو انجمن اسلامیہ لاہور نے آپ کو شاہی مسجد کا خطیب مقرر کر دیا۔

حضرت علامہ حلوائی رحمۃ اللہ علیہ علوم شریعت کے ساتھ ساتھ روحانی منازل طے کرنے میں اپنے معاصرین میں صف اول پر تھے۔ آپ سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ میں حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ خلیفۂ مجاز، دائم الحضوری حضرت مولانا غلام محی الدین قصوری رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ مجاز تھے۔ آپ نے اپنی تصنیف ''تحصیل العرفان

فی آداب المشائخ والاخوان'' میں سلوک و طریقت پر بڑی مفید باتیں کی ہیں۔ آپ
تصوف کو ذکر الٰہی اور اطاعت رسول ﷺ کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ آپ ان صوفیائے
خام پر سخت تنقید کرتے تھے جو مزامیر، ساز و رنگ اور رقص و سرود کو اپنی مجالس ذکر میں
روا رکھتے تھے۔ آپ کے نزدیک وہ صوفیائے خام قابل مذمت تھے جو عوام کو دھوکہ
دینے کیلئے لباسِ فقر اختیار کرتے تھے۔ آپ اپنے پیر و مرشد شیخ مولانا غلام دستگیر
قصوری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد پنجاب کے بلند پایہ شیخ طریقت پیر سید جماعت علی
شاہ لاثانی علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ اگرچہ آپ ابتدائی طور پر اپنے
استاد پیر عبدالغفار شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ سے قادریہ سلوک میں استفادہ کر چکے تھے۔ مگر
سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ سے مراحل روحانیت طے کرنے میں مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ
اور حضرت سید پیر جماعت علی شاہ علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے زیر تربیت رہ کر بھرپور استفادہ
کیا۔ معمولات نقشبندیہ پر ساری زندگی کاربند رہے۔ پھر ایسے سالکان طریقہ
نقشبندیہ مجددیہ کو تربیت دی جن سے یہ سلسلہ عالیہ چشمے کی طرح جاری و ساری رہا۔
آپ کے زیر تربیت سالکان کی ایک خاصی تعداد پاکستان اور ہندوستان کے مختلف
خطوں میں سلوک مجددیہ کی اشاعت میں سرگرم رہی، خصوصاً ریاست جموں و کشمیر اور
گجرات میں آپ کے مریدوں کا ایک سلسلہ وسیع پیمانے پر کام کرتا رہا۔

مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۳۱۵ھ):

آپ کے پیر و مرشد الشیخ ابو عبدالرحمٰن، مولانا غلام دستگیر قصوری الہاشمی القریشی
صدیقی رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے بلند پایہ بزرگ تھے۔ ان کے علمی اور روحانی کمالات کا
برِصغیر پاک و ہند کے علاوہ علمائے حرمین الشریفین نے بھی اعتراف کیا۔ آپ لاہور
موچی دروازہ کے اندر محلہ چہل بیبیاں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ گرامی حضرت
مولانا حسن علی صدیقی اپنے زمانہ کے مقتدر علماء کرام میں سے تھے۔ آپ حضرت خواجہ
دائم الحضوری مولانا غلام محی الدین قصوری رحمۃ اللہ علیہ کے خواہر زادہ اور داماد تھے۔

آپ اپنے وقت کے مروجہ علوم و فنون پر دسترس رکھتے تھے۔ آپ شیخ طریقت
ہونے کے ساتھ ساتھ وقت کے بلند پایہ عالم دین اور مناظر کی حیثیت سے آسمان شہرت پر
درخشاں رہے۔ آپ کی تصانیف اہلِ علم و فضل کے ہاں بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ تحفہ
... تحقیق الصلوٰۃ الجمعہ، ظفر المقلدین، جواہر قضیہ رد نیچریہ اور تقدیس الوکیل عن توہین
... الخلیل خصوصی طور پر کئی بار چھپ کر ملک میں پھیلیں۔ آپ نے ۱۳۱۵ھ میں
قصور میں وصال فرمایا اور آپ کا مزار قصور کے بڑے قبرستان میں مرجع خلائق ہے۔
حضرت مؤلف علّام مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے علمی اور روحانی
مراحل طے کرنے میں ایک عرصہ گزارا۔ جب مؤلف نے ''تفسیر نبوی'' کی تالیف کا
آغاز کیا تو آپ کے پیر و مرشد نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا پنجابی شعر میں جو ترجمہ کیا وہ
مولانا حلوائی نے ''تفسیر نبوی'' کی ہر سورۃ کی تفسیر کے ابتداء میں بطور تبرک لکھا۔

اسم اللہ دے نال شروع ہے جو بخشش داسائیں
کامل مہر محبت والا پالے آخر تائیں

مرشد اول مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد مؤلف علام نے
اللہ کے معروف شیخ طریقت حضرت سید پیر جماعت علی شاہ لاثانی علی پوری رحمۃ اللہ علیہ سے
بیعت کی اور تاحیات نقشبندی مجددی طریقہ عالیہ پر گامزن رہے۔

جماعت علی شاہ لاثانی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۵۱-۸-۳۰):

حضرت پیر سید جماعت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ علی پور سیداں سیالکوٹ سنہ ۱۲۳۳ھ میں پیدا
ہوئے اور مفتی عبداللہ ٹونکی، مولانا مظہر اللہ خان سہارنپوری، مولانا فیض الحسن
سہارنپوری اور الشاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے علوم دینیہ میں کمال حاصل کیا۔
آپ نے کتابی علوم کے ساتھ ساتھ روحانی سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کی اشاعت سے
بے پناہ مخلوق خدا کو فیضیاب کیا۔ آپ چورہ شریف کے حضرت خواجہ فقیر محمد تیراہی رحمۃ اللہ علیہ
کے خلیفہ تھے۔ آپ کا وصال ۱۳۷۰ھ میں ہوا اور علی پور سیداں میں آسودۂ خاک ہوئے۔

مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے سابقہ پیرومرشد کے وصال کے بعد حضرت
پوری لاثانی رحمۃ اللہ علیہ سے جو فیض پایا تھا اس کا اعتراف اپنی کتاب ''شفاء القلوب'' میں
اشعار میں کیا ہے۔

بعد وصال محبوب اپنے دے اس عاجز حلوائی
صوفی علی پوری تھیں پایا فیض اتے وڈیائی

غریب یتیماں دی تربیت کردے جیونکر مرد رحمانی
اوویں حضرت لاثانی رحمۃ اللہ علیہ بخشے فیض روحانی

چوہاں طریقیاں وچ اجازت حضرت صاحب پائی
ماہر رمز فقر دے اندر رکھ دا قلب صفائی

فاضل جلیل حضرت مؤلف علام مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ نے جب علمی اور روحانی اقتدار کی نشو ونما میں حصہ لیا اس کا اعتراف آپ کے معاصر علماء کرام اور مشائخ عظام نے بھی کیا۔ آپ نے مختلف تصانیف اور عقائد باطلہ کی تردید میں بڑی وسیع اور معیاری کتابیں لکھیں۔ آپ نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ قرآن پاک کی بلند پایہ تفسیر ''تفسیر نبوی'' کی تالیف میں صرف کیا۔ یہ تفسیر پندرہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور پنجابی اشعار کا ایک بے بہا خزانہ ہے۔ احسن القصص، قصص المحسنین، تفسیر نبوی کی جلد ششم کا ایک حصہ ہے جسے اردو نثر میں مولانا پروفیسر غلام مصطفیٰ صاحب مجددی ایم اے کے قلم سے شائع کیا گیا۔ آپ نے ''تفسیر نبوی'' کو قرآن پاک کے بیشمار موضوعات کے علاوہ اعتقادی اور نظریاتی مسائل کا ایک عظیم الشان مرقع بنا کر پیش کیا ہے۔

ہم سابقہ صفحات میں ضمناً بیان کر آئے ہیں کہ حضرت مؤلف علام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وقت کے جید علمائے اہلسنّت سے علوم دینیہ پر عبور حاصل کیا۔ خصوصاً آپ کے استادِ گرامی مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی تربیت پر خصوصی توجہ دی اور اصلاح

اعتقاد کے لیے اپنے اس شاگرد رشید کو تیار کیا۔ اس وقت برِصغیر میں انگریزی حکومت کے زیر سایہ جن دینی فتنوں نے سر اٹھایا تھا ان کی سرکوبی میں فاضل مؤلف نے اہم کردار ادا کیا۔ آپ نے تصنیف و تالیف کے مؤثر ہتھیاروں سے بدعقیدہ مولویوں کے اثرات کو بے اثر کر کے رکھ دیا۔ اس اہم کام کے لیے آپ نے تمام دنیاوی فوائد سے دستبردار ہو کر صرف اور صرف اعتقادی اصلاح کا کام کیا۔ آپ نے اپنی زرعی زمین، کاروبار، آبائی مکان اور دوسری جائیداد تمام کی تمام اس کام میں لگا دی۔ لاہور میں ایک مسجد تعمیر کرائی، ایک مدرسہ قائم کیا، پھر ''تفسیر نبوی'' کی تالیف و تصنیف اور اس کی اشاعت پر سارا مال و زر صرف کر دیا۔ دہلی دروازہ لاہور کے باہر سٹی کوتوالی کے فاصل دو منزلہ مسجد بنوائی۔ مسجد کے ساتھ حجرے تعمیر کروائے اور اس میں مدرسہ قائم کیا۔ اس وقت جن دینی فتنوں کا سامنا تھا ان سے اپنے مرکز کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنی مسجد کی پیشانی کے پتھر پر یہ عبارت لکھوا دی۔

''یہ مسجد خالص حنفیہ کرام کی ہے کوئی غیر مذہب یہاں آ کر اپنے افعال ادا نہیں کر سکتا جس سے مناقشت پیدا ہو''۔

فقیر محمد نبی بخش حلوائی متولی مسجد ہذا (مؤلف تفسیر نبوی) ۱۳۵۴ھ

آپ کے استادِ گرامی مولانا غلام قادر بھیروی رحمۃ اللہ علیہ کی بیگم شاہی مسجد لاہور کے بعد یہ دوسری مسجد تھی جسے اہلسنّت کا اعتقادی اور نظریاتی مرکز بنا دیا گیا تھا اور یہاں سے اعتقادی اصلاح کی جو کرنیں پھوٹیں انہوں نے سارے پنجاب کو منور کیا۔ آپ کے اس مرکز کی شہرت سارے پنجاب میں پھیلی اور دور دور سے علماء کرام اور مشائخ نے آپ سے اعتقادی مسائل کا حل دریافت کیا۔

مولانا نابغ علی نسیم رحمۃ اللہ علیہ (م: ۲۰۰۰-۲-۲۹):

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے تدریسی شعبہ نے کئی قابلِ ذکر طلبہ اور شاگردوں کو زیورِ تعلیم سے نوازا تھا مگر آخری دور میں آپ کے زیرِ تعلیم رہنے والے

جن تلامذہ نے تکمیل کے بعد دنیائے علم وفضل میں بڑا نام پیدا کیا ان میں آپ کے خلیفہ مجاز مولانا باغ علی صاحب نسیم کا نام سرفہرست ہے۔ مولانا باغ علی نسیم نقشبندی نے آپ سے پڑھا اور مرکزی دارالعلوم حزب الاحناف لاہور سے دستارِ فضیلت حاصل کی۔ پھر استادِ گرامی کی جانشینی اور علمی مسند کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ آپ کی مسجد کو نگران کی حیثیت سے قائم ودائم رکھا، آپ کے مدرسہ کو جاری وساری رکھا، آپ کے کتب خانہ اور تالیفات کو زیورِ طباعت سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ پھر آپ کے نام کو زندہ رکھنے کیلئے آپ کے نام پر لاہور میں ''مکتبہ نبویہ'' قائم کر کے بے پناہ کتابیں شائع کیں اور ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچائیں۔ مولانا باغ علی نسیم نے اپنے پیرومرشد کے سالانہ عرس کے اہتمام کو بڑی پامردی سے جاری رکھا۔ آپ کے مریدوں کو ہر سال عرس کی تقاریب میں بلا کر سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کی تربیت دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی:

مولانا باغ علی نسیم نقشبندی کی رفاقت میں حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک اور شاگرد رشید پیرزادہ اقبال احمد فاروقی ایم۔اے (راقم) نے حضرت کے تالیفی اور تصنیفی کام کو جاری رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ حضرت حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی پر تحقیقی کام کرنے والے ایک عالم دین نے لکھا تھا کہ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی نے ایک عرصہ تک اپنے استاد حضرت مولانا نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی تعمیر کردہ مسجد میں ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۶ء تک خطابت جمعہ کی خدمت کو سرانجام دیا اور اپنی قوت بیانیہ اور اعلیٰ طرزِ خطابت سے لاہور میں خطیبانہ انداز کو امتیاز بخشا۔ آپ کا نام اپنے وقت میں لاہور کے ان چند خطباء میں شامل تھا جنہوں نے اپنی اپنی مساجد میں اپنے خطیبانہ انداز کو منوایا۔ حضرت کی جامع مسجد میں سامعین کا اتنا عظیم مجمع آپ کے اس شاگرد کی خطابت کی کشش سے ہوا کرتا تھا۔

پیرزادہ مولانا اقبال احمد فاروقی نے خطابت کے ساتھ ساتھ ''مکتبہ نبویہ'' کے سٹیج

سے نہایت ہی گراں قدر مطبوعات کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ بڑی بڑی بلند پایہ کتابوں کے تراجم کیے، عمدہ تصانیف لکھیں اور اپنے رنگین قلم سے عمدہ تحریروں کی طباعت واشاعت میں شہرت حاصل کی۔ پیرزادہ فاروقی ایک اعلیٰ قلمکار کی حیثیت سے دنیائے علم وادب میں ابھرے اور اہلِ علم وفضل سے داد وتحسین حاصل کی۔ آپ نے مکتبہ نبویہ کی مطبوعات کی اشاعت وترتیب کے ساتھ ساتھ ''مرکزی مجلسِ رضا لاہور'' کی مطبوعات کو تقسیم واشاعت کرنے میں بڑی جدوجہد کی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس میدان میں بھی ان کے قلم وفکر نے مرکزی مجلس رضا کے ماہنامہ ''جہانِ رضا'' کو بڑی مقبولیت سے ہمکنار کیا۔ (جہانِ رضا کے اداریوں پر مشتمل ایک کتاب ''فکرِ فاروقی'' کے نام سے مولانا محمد عالم مختار حق نے مرتب کر کے مکتبہ نبویہ لاہور سے شائع کی ہے)

مولانا محمد عالم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۹۹-۸-۲۰):

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک اور شاگرد رشید حافظ محمد عالم صاحب ہیں جنہوں نے تدریسی اور علمی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔ مولانا حافظ محمد عالم صاحب حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی توجہ کا مرکز رہے اور آپ نے دینی علوم متداولہ کی تحصیل کے بعد سیالکوٹ میں ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ حافظ محمد عالم صاحب نے اپنی شبانہ روز محنت اور کوششوں سے سیالکوٹ میں ہزاروں حافظانِ قرآن اور دینی علوم کے ماہر علمائے کرام کی تربیت کا زبردست کام سرانجام دیا۔ سیالکوٹ حافظ محمد عالم صاحب کی تدریسی اور دینی خدمات سے ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ آپ نے نہ صرف تدریسی اور علمی میدان میں نام پیدا کیا بلکہ عوام میں اعتقادی نشوونما کو فروغ دیا۔ آج حافظ محمد عالم صاحب کے ہزاروں شاگرد علمائے دین اور حفاظ کی شکل میں ملک کے مختلف گوشوں سے علم دین کی اشاعت میں مصروف ہیں۔ آپ نے جب جمعیت علمائے پاکستان کے ٹکٹ پر انتخابی میدان میں قدم رکھا تو سیالکوٹ کے عوام نے آپ کو بڑھ چڑھ کر ووٹ دیئے۔

صوفی غلام حسین گوجروی:

صوفی غلام حسین گوجروی مرحوم مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک
شاگرد تھے، اگرچہ صوفی غلام حسین گوجروی سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں حضرت صا
سید علی حسین شاہ علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ مگر آپ نے دینی علوم کی تحصیل
مولانا حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ سے کی تھی۔ مولانا گوجروی نے دارالعلوم مرکزی
الاحناف لاہور سے فارغ التحصیل ہو کر ایک خطیب کی حیثیت سے بڑا نام پیدا
پاکستان کا ایک ایک شہر اور ایک ایک قریہ مولانا گوجروی کی خوش بیانیوں اور تقار
گونجتا رہا۔ خوش آواز تھے اور اپنی خوش بیانی سے سامعین کو مسحور کر دیتے تھے۔ ان کی
تقریر سننے کے لیے ہزاروں لوگ دور دور سے آتے۔

ان تین نامور شاگردوں کے علاوہ آپ کے مدرسہ سے سیکڑوں طلبہ علوم
سے فیضیاب ہو کر نکلے اور زندگی کے مختلف امور میں مصروف ہوئے۔ مگر ایک
حیثیت جو آپ کے شاگردوں میں پائی جاتی ہے وہ ان کے حنفی سنی عقیدہ کی پختگی
محبوب کبریا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے جو ان کی زندگیوں کا حسن رہا
ہم ان سیکڑوں طلبہ کا تذکرہ لکھنے سے قاصر ہیں جنہوں نے آگے چل کر حضرت
علام رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ اور تدریس کا نام روشن کیا۔

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان میں معمولی سی لکنت
جس کی وجہ سے آپ ایک خطیب یا مقرر کی حیثیت سے تو شہرت نہ پا سکے مگر آپ
تصنیف و تالیف کے میدان میں جو مقام حاصل کیا وہ آپ کے علاوہ لاہور نہیں
پنجاب بھر میں شاید ہی کسی دوسرے سنی اہلِ قلم کو ملا ہو۔ آپ پنجابی کے ایک بے مثال
شاعر تھے، اگرچہ آپ نے عقائد کی اصلاح پر مختلف کتابیں تصنیف کیں مگر پنجابی اشعار
میں ان کی تصانیف کا بہت بڑا ذخیرہ سامنے آیا جس سے پنجاب کے دور دراز علاقوں
میں ایک علمی اور اعتقادی انقلاب برپا ہو گیا۔ آپ پنجابی کے علاوہ اردو، فارسی

کے بلند پایہ شاعر اور ادیب بھی تھے آپ جس طرح نثر میں لکھتے اسی روانی بلکہ اس
زیادہ روانی کے ساتھ شعر میں بات کرتے۔ دراصل آپ کے سامنے خطہ پنجاب میں
والے دینی فتنوں کی اصلاح تھی۔ چنانچہ آپ کی تصانیف کا زیادہ حصہ پنجابی میں
ہے۔ آپ نے پندرہ جلدوں میں قرآن پاک کی پنجابی اشعار میں تفسیر لکھی جسے
تفسیر نبوی'' کے نام سے شہرت ملی۔ یہ تفسیر ایک بے مثال تفسیر ہے جسے چالیس تفاسیر
کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے اور اس کے مقابلہ میں اتنی بڑی پنجابی تفسیر کہیں نہیں ملتی۔
صغیر میں لکھی جانے والی تفسیریں ''تفسیر نبوی'' کی تشریح معانی تک نہیں پہنچ پاتیں۔

حضرت علامہ حلوائی دین اسلام کے سچے ترجمان تھے۔ وہ فقہ حنفی کے شارح تھے
اور عقائد اہلسنّت کے دفاع کے لیے اعتقادی قلعہ کے محافظ تھے۔ آپ کی منظوم اور
منثور تصانیف کا ہر صفحہ اس بات کی شہادت دیتا ہے۔ کہ آپ بے مثال مفسر قرآن اور
بلند پایہ پنجابی شاعر تھے ''تفسیر نبوی پنجابی'' کی پندرہ ضخیم جلدوں کے علاوہ آپ نے
مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں جو عوام میں مقبول و مطبوع ہوئیں:

- شفاء القلوب بالصلوٰۃ علی المحبوب (پنجابی اشعار)
- خیر الہدیٰ فی عدم الجمعۃ فی القریٰ (اردو، عربی، فارسی)
- الامتیاز بین الحقیقت والمجاز (اردو)
- النار الحامیہ لمن ذم المعاویہ (اردو)
- مجموعۃ الرسائل اربعہ (اردو، پنجابی اشعار)
- مجموعۃ الرسائل خمسہ (اردو، پنجابی اشعار)
- رسالہ جامع الشواہد (اردو)
- انتباہ المنکرین من الصلوٰۃ سید المرسلین (اردو)
- احسان الاموات بالصدقات والاسقاط (اردو)
- اطلاع الناس فی طلاق الثلاث (پنجابی، اردو)

❁ اظہار انکار المنکرین من صلوٰۃ المحبین (اردو)

❁ انواع نبوی (پنجابی اشعار)

❁ سبیل الرشاد فی حق الاستاد (اردو)

❁ تحصیل العرفان فی آداب المشائخ والاخوان (اردو)

ان کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن چھپے اور تقسیم ہوئے مگر ہم جس اہم اور ضخیم کتاب کا تعارف کرانا چاہتے ہیں وہ آپ کی مشہور زمانہ تصنیف "تفسیر نبوی" پنجابی (اشعار) ہے۔ جس کی چھٹی جلد تفسیر سورۂ یوسف (احسن القصص و قصص المحسنین)

تفسیر نبوی

تفسیر نبوی پندرہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، یہ تفسیر پنجابی اشعار میں لکھی گئی اس کے کئی ایڈیشن چھپے اور تقسیم ہوئے۔ مولف علام رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں "وہابیوں" نے خطہ پنجاب میں بڑے مکروہ اثرات مرتب کیے تھے اور وہابی علماء نے عبدالوہاب نجدی کی "کتاب التوحید" سے متاثر ہو کر اعتقادی دنیا میں طوفان بدتمیزی برپا کر دیا تھا۔ خصوصاً پنجاب کے دیہاتوں میں وہابی علماء عوام کے سامنے شرک اور بدعت کا مسئلہ اٹھا کر عام مسلمانوں کو مشرک اور بدعتی قرار دیتے جاتے۔ حافظ محمد لکھوی نے خصوصیت کے ساتھ پنجاب کے دیہاتوں میں اس دینی فتنے کو فروغ دیا اور "تفسیر محمدی" لکھ کر دیہاتی علماء کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ نے اس فتنہ کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے قلم اٹھایا اور آہستہ آہستہ پندرہ جلدوں میں "تفسیر نبوی" لکھی اور دیہات میں تقسیم کی۔ اس تفسیر نے بڑے اچھے اثرات مرتب کیے اور عوام میں پھیلی ہوئی وہابیت کو روک دیا اور اس کے اثرات زائل ہونے لگے۔

❁ تفسیر نبوی کی جلد اول کا پہلا ایڈیشن لاہور کے مطبع مفتی فخر الدین سے ۱۳۱۷ھ میں چھپا۔ جلد اول تین سو بیاسی ۳۸۲ صفحات پر مشتمل تھی اور سورۃ البقرہ کی تفسیر تھی۔ اس کی ابتداء یا ابتدائی شعر آپ کے پیر و مرشد اور استاد گرامی حضرت

مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دست پاک سے خود لکھا۔

اسم اللہ دے نال شروع ہے جو بخشش دا سائیں
کامل مہر محبت والا پالے آخر تائیں

- اس تفسیر کی جلد دوم لاہور ہی میں ۱۳۲۰ھ میں چھپ کر سامنے آئی جو چار سو چھیاسی ۴۸۶ صفحات پر مشتمل تھی۔ یہ سورۂ آل عمران اور سورۃ النساء کی ترجمان ہے۔
- تفسیر نبوی جلد سوم لاہور میں ۱۳۳۴ھ میں لکھی گئی مگر گلزار محمدی سٹیم پریس لاہور سے ۱۳۴۱ھ میں چھپی تھی۔ یہ جلد دو سو نوے ۲۹۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ سورۂ یونس اور سورۂ ہود کی تفسیر ہے۔
- جلد چہارم (سورہ اعراف تا سورہ توبہ) ضخامت ۴۶۰ صفحات مطبوعہ لاہور (س-ن)۔
- تفسیر نبوی جلد پنجم (سورہ یونس تا سورہ ہود) لاہور سے ۱۳۳۱ھ میں چھپی۔ مشتمل بر ۱۹۲ صفحات۔
- جلد ششم (احسن القصص اور قصص المحسنین) سورۂ یوسف کی تفسیر و تشریح ہے۔ یہ کریمی سٹیم پریس لاہور سے ۱۳۴۳ھ میں پہلی بار چھپی۔ یہ سورۂ یوسف کی ضخیم اور طویل تفسیر ہے اور چھ سو ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ واقعہ یوسف پر بڑی بلند پایہ پنجابی تفسیر ہے۔

ہم اس جلد کو قارئین کی خدمت میں اردو میں پیش کر رہے ہیں۔ اس کتاب نے پنجاب کے دیہات میں بڑی مقبولیت حاصل کی تھی اور اس کے کئی ایڈیشن چھپ کر تقسیم ہوئے۔ آج یہ از سر نو اردو لباس میں ملبوس آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

- تفسیر نبوی کی ساتویں جلد کریمی سٹیم پریس لاہور سے چھپی۔ یہ چار سو تیس ۴۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں سورۃ الرعد، ابراہیم، الحجر، النمل اور سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر ہے۔

- آٹھویں جلد سورۂ کہف سے لے کر سورۂ المومنون پر مشتمل ہے یہ جلد دو سو ۲۲۰ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اسے بھی لاہور کے مطبع کریمی سٹیم پریس سے چھپوایا گیا۔
- جلد نہم پانچ سو باون ۵۵۲ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اسے سورۂ نور سے لے کر عنکبوت تک لکھا گیا تھا اور یہ بھی کریمی سٹیم پریس لاہور سے چھپی تھی۔
- جلد دہم لاہور کے مطبع کریمی سٹیم پریس سے چھپی تھی یہ سورۃ الروم سے لے سورۂ فاطر تک لکھی گئی تھی اور یہ جلد دو سو چار ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔
- گیارہویں جلد لاہور کے مطبع کریمی سٹیم پریس سے ایک سو ساٹھ ۱۶۰ صفحات چھپ کر سامنے آئی۔ یہ سورۃ یٰسین سے لے کر سورۂ سجدہ تک کی سورتوں پر مشتمل ہے۔
- بارہویں جلد دو سو تیس ۲۳۰ صفحات پر مشتمل ہے یہ سورۂ شوریٰ سے لے کر ذاریات کے مضامین کی تفسیر ہے۔ یہ بھی کریمی سٹیم پریس لاہور سے چھپی تھی۔
- تیرہویں جلد مطبع کریمی سٹیم پریس لاہور میں چھپی جو ایک سو انتیس ۱۲۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ تفسیر سورۂ طور سے لے کر سورۂ تحریم تک کا مجموعہ ہے۔
- "تفسیر نبوی" کی چودھویں جلد لاہور کے مطبع کریمی پریس میں چھپ کر سامنے آئی یہ ایک سو سولہ ۱۱۶ صفحات پر مشتمل ہے اور یہ سورۂ الملک سے لے کر المرسلات تک پھیلی ہوئی ہے۔
- تفسیر نبوی کی پندرہویں جلد ۱۳۵۱ھ میں چھپی یہ سورۂ النباء تیسویں ۳۰ پارہ کے آغاز سے لے کر سورۃ الناس تک ہے اور اس طرح یہ بے بہا خزانہ پنجابی اشعار میں عوام الناس تک پہنچا۔

اس طرح یہ عظیم الشان تفسیر چار ہزار چار سو انتالیس ۴۴۳۹ صفحات پر مشتمل دنیائے علم میں آئی اور آپ کی زندگی کے ۳۴ سالوں (۱۳۱۷-۱۳۵۱ھ) میں مکمل ہوئی۔

تفسیر نبوی کی تالیف میں مؤلف علام رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا ایک طویل حصہ صرف ہوا اور اس کی آپ کی زندگی میں ہی اس کی شہرت اور مقبولیت سامنے آتی رہی۔ آپ نے اسے پنجاب کے مختلف علاقوں میں پھیلانے میں بھرپور حصہ لیا۔ خصوصاً ریاست جموں کے دیہاتی علاقوں میں اسے پھیلایا گیا۔ پھر گجرات کے دیہاتوں میں اس کی پذیرائی تفسیر محمدی جسے حافظ محمد لکھوی نے چھپوا کر پنجاب میں تقسیم کیا تھا اور اس کا اثر پنجاب کے ضلع فیروزپور، قصور، اوکاڑہ، بہاولنگر اور دوسرے علاقوں میں مرتب تھا "تفسیر نبوی" نے ان علاقوں میں بھی اپنے اثرات مرتب کیے اور عقائد کی اصلاح کا کام کیا۔ اس تفسیر پر علمائے اہلسنّت نے اپنے گہرے تاثرات کا اظہار کیا اور وقت کے جید علمائے کرام نے مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات کو داد و تحسین سے نوازا۔ اس وقت کے جلیل القدر علمائے کرام کی آراء تفسیر نبوی کی بعض جلدوں کے آغاز اور آخرین صفحات پر ہمارے سامنے آئی ہیں۔

اگرچہ حضرت مؤلف علام رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و تصانیف پر راقم (پیرزادہ اقبال احمد فاروقی ایم-اے) نے مختلف تحریروں پر تبصرے کیے اور مختلف کتابوں میں احوال و مقامات حضرت حلوائی رحمۃ اللہ علیہ پر گفتگو کی ہے مگر حال ہی میں (۱۹۹۵ء) میں ہمارے ایک فاضل اور نوجوان سکالر الحافظ خورشید احمد القادری نے آپ پر عربی میں ایک مفصل کتاب لکھی ہے جس کا نام "العلامة محمد نبی بخش الحلوانی …… جهاته و مؤلفاته" ہے۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے بڑی تفصیل سے عربی زبان میں حضرت الشیخ الحلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و مقامات پر محنت اور تحقیق سے قلم اٹھایا۔ ہم الحافظ خورشید احمد القادری کی اس محنت کو داد و تحسین پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے عربی زبان میں مؤلف علام رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کو جمع کر کے دنیائے علم و فضل کو خاص کر عالم عرب کو ایک پنجابی مفسر قرآن کو متعارف کروایا ہے۔ ہم ان کی اس کاوش کے لیے بھی ممنون

ہیں کہ اس مقدمہ کی تیاری میں ہمیں آپ کی اس عربی کتاب سے بڑی مدد ملی۔

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقشبندی مجددی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی اہل علم و فضل کے حلقہ میں بسر کی اور وقت کے جلیل القدر علمائے کرام اور مشائخ عظام سے علمی اور روحانی استفادہ کیا مگر عمر کے آخری حصہ میں آپ کے چند معاصرین کا تذکرہ کے لیے آپ کے علمی اور اعتقادی حلقہ کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہوگا۔

مؤلف علام رحمۃ اللہ علیہ کے استادِ محترم مولانا غلام دستگیر قصوری اپنے وقت کے عالمِ دین تھے اور پھر ایک باکمال مناظر تھے۔ انہوں نے عیسائی، ہندو، آریہ، ملحد، رافضی، نیچری، مرزائی، وہابیوں اور دیوبندیوں سے مناظرے کیے۔ آپ شاگردِ رشید حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ نے قلمی جہاد میں بھرپور حصہ آپ کی ان قلمی خدمات کو جہاں دوسرے علماء کرام نے قدر کی نگاہ سے دیکھا جب امام اہلسنّت، مجدد مائۃ حاضرۃ، اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بے پناہ مسرت کا اظہار فرمایا۔ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی تفسیر نبوی کی اشاعت اظہارِ مسرت کرتے ہوئے کئی خط لکھے۔ آج تفسیر نبوی کا اردو نثری ایڈیشن کنز الایمان کے الفاظ سے مزین ہے۔ مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کا اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی وفات تک آپ سے قریبی رابطہ رہا۔

صدر الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی انجمن حزب الاحناف لاہور کے جلسوں میں تشریف لاتے تو حضرت مولانا حلوائی رحمۃ اللہ علیہ ان کی دینی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں ملنے جاتے اور آپ کی علمی خدمات کی قدر کرتے اور حوصلہ افزائی کے طور پر آپ کی مسجد میں ہر سال ملاقات کے لیے خصوصی طور پر تشریف لا کرتے تھے۔

صدر الافاضل کے ایک شاگرد رشید مفتی احمد یار خاں نعیمی بدایونی رحمۃ اللہ علیہ جب گجرات میں آئے تو انہوں نے ایک شعبۂ تصنیف و تالیف قائم کیا۔ "تفسیر نعیمی" کی

اول جلدیں حضرت مولانا نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر سے گزریں تو آپ نے بڑی تعریف کی۔ پھر مولانا مفتی احمد یار نعیمی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "جاء الحق وزہق الباطل" آئی تو آپ کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔ خود گجرات پہنچے، کتاب کی اشاعت پر ہدیۂ تبریک پیش کیا، نذرانہ دیا اور ایک سو جلدیں خرید کر اپنے حلقۂ احباب میں مفت تقسیم کیں۔

حضرت مولانا سید دیدار علی شاہ الوری (م ۱۳۵۴ھ) لاہور میں آئے تو سب سے پہلے دار العلوم نعمانیہ میں مدرس مقرر ہوئے۔ مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ سے مراسم قائم ہوئے، ان کی نسبت سے آپ کے دونوں صاحبزادگان حضرت مولانا ابو الحسنات خطیب مسجد وزیر خان اور علامہ ابو البرکات سید احمد قادری رحمۃ اللہ علیہما سے تا دمِ آخر مراسم قائم رہے۔ حضرت مولانا غلام قادر بھیروی، مولانا معوان حسین رامپوری خطیب شاہی مسجد لاہور، پیر عبد الغفار شاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ تو حضرت مؤلف کے اساتذہ میں سے انہی کے رفقائے علم مولانا اصغر علی روحی (م ۱۳۷۲ھ) مولانا تاج الدین قادری تاج الدین چشتی، مولانا محرم علی چشتی، سید احمد علی بٹالوی (م ۱۳۲۶ھ) علامہ نور توکلی سیکرٹری انجمن نعمانیہ لاہور (م ۱۳۶۷ھ) جیسے بلند پایہ علمائے اہلسنّت آپ کے حلقۂ احباب میں تھے۔ مشائخ کرام میں حضرت پیر سید جماعت علی شاہ لاثانی علی پوری رحمۃ اللہ علیہ تو آپ کے پیرو مرشد تھے مگر آپ میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۴۷ھ) مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ، خواجہ خان عالم محی الدین باولی شریف رحمۃ اللہ علیہ ضلع گجرات اور امیر ملت حضرت پیر حافظ جماعت علی شاہ صاحب علی پوری رحمۃ اللہ علیہ جیسے مشائخ کرام سے آپ کو بے حد عقیدت تھی۔ مولانا محمد مہر الدین نقشبندی (م ۱۹۸۹ء) آپ کے مدرسہ کے جزوقتی استاد رہے ہیں اور ایک عرصہ تک آپ کے مدرسہ کے استاد اعلیٰ اور تصنیفی و تالیفی کام کے نگران بھی رہے ہیں۔ آپ کے احباب میں سے چند معاصرین کے نام آپ کی تصانیف میں بھی ملتے ہیں۔ حافظ فتح محمد مجددی اچھروی بانی دار العلوم نقشبندیہ اچھرہ لاہور، مولانا محمد عالم لاہوری، مولانا محمد شریف سیالکوٹی، مولانا صاحبزادہ

عبدالرسول قصوری، مولانا یار محمد گڑھی اختیار خان، مولانا محمد عبداللہ گجراتی، مولانا
محی الدین باولی شریف، مولانا محمد سعید بریلوی، مولانا فضل حسین لوہارکی، مولانا عبدالر
قصوری، صاحبزادہ محمد حسین علی پوری، مولانا عبدالحکیم پشاوری، مولانا اکرام الدین
بخاری (خطیب مسجد وزیر خان)، مولانا عبدالحکیم کلانوری، مولانا احمد بخش المتخلص
قصوری، سید حامد حسین اجمیری، مولانا محمد نذیر عرشی، (صاحب مفتاح العلوم شرح
مثنوی مولانا روم) مولانا شفیق احمد بگوی، مولانا ذاکر حسین بگوی، مولانا محمد شرف
الدین شاہ پوری، مولانا ضیاء الدین گجراتی، مولانا محمد حسین پسروری، مولانا امام الدین
کوٹلی لوہاراں سیالکوٹ، مولانا محمد شریف کوٹلی لوہاراں، مولانا محمد نعیم پشاوری، مفتی ولی
جالندھری اور حضرت مولانا وصی احمد سورتی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین آپ کی مجالس علم
کے مخلص احباب تھے۔

حضرت مؤلف علام رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے آخرین چند برسوں میں راقم کو آپ کے دستر خوان علم و عرفان سے خوشہ چینی کی سعادت ملی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آپ عہد شباب کی وادیاں طے کرنے کے بعد زمانہ پیری میں قدرے آرام پسندانہ وقت گزارنے لگے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ باعث پیری و کہولت آپ کے بعض معمولات میں تبدیلی ضرور آئی تھی مگر کوتاہی نہیں آئی تھی۔ آپ شب و روز دین کی خدمت میں مشغول رہتے۔ شب بیداری معمول بن گیا تھا، رات کا اکثر حصہ نوافل کی بجائے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں درود پاک پیش کرنے میں گزرتا۔ تہجد کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی نہ ہوتی۔ آپ اس معاملہ میں اتنے سخت گیر تھے کہ طلبہ کو تو معاف کر دیتے مگر جو سالک درویش آپ کے زیر تربیت تھے ان کی معمولی کوتاہی کا بھی سخت نوٹس لیتے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد تمام اساتذہ طلبہ اور درویش کھجور کی گٹھلیوں پر درود پاک کا ورد کرتے۔ درود پاک کی محفل ختم ہوتی تو طالبانِ طریقت فرداً فرداً تلاوت قرآن پاک میں مصروف ہو جاتے اور طلبہ اپنے اپنے اساتذہ کے حلقوں میں تدریس میں جا بیٹھتے۔

اس زمانہ میں آپ کی نظر کمزور ہو چکی تھی مگر تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری تھا۔ آپ اپنے شاگردوں میں کسی ایک کو اپنے پاس بٹھا لیتے اور کتاب لکھواتے جاتے۔ حوالے کے لیے مختلف کتابوں سے حوالوں کی نشاندہی خود فرماتے اور لکھنے والا ان عبارتوں کی تفصیل پہلے آپ کو سناتا پھر انہیں موقع محل پر درج کرتا۔ اس سلسلہ میں مولانا باغ علی نسیم، مولانا برکت علی شہید اور غلام حسین شہید آف جموں آپ کے کاتبان تصانیف میں سے تھے۔ کبھی کبھی راقم کو بھی اپنے پاس بٹھا کر چند صفحات کی املا دیتے اور اس سعادت میں تربیت دیتے۔

نمازِ عصر کے بعد ختم خواجگان کی مجلس ہوتی۔ اس میں سترہ آدمیوں سے زیادہ شریک نہ ہوتے۔ اس مجلس میں بیٹھنے والوں پر یہ پابندی تھی کہ وہ سارے دن میں کسی نماز کی قضا کے مرتکب نہ ہوئے ہوں۔ حقہ یا سگریٹ نہیں پیتے، ختم کے دوران مکمل خاموشی ہوتی، صرف میر مجلس کسی کلمہ کی تبدیلی کے وقت ''حقا'' بلند آواز سے کہتا اور اس کلمہ کی طرف متوجہ کرتا جو آگے پڑھنا ہوتا۔

آپ کو بعض وظائف اور عملیات روحانیہ پر بڑا عبور حاصل تھا۔ ضرورت مند لوگ دور دور سے تعویذات حاصل کرنے آتے۔ آپ ان عملیات کی روشنی میں ان ضرورت مندوں کی ضرورتوں کو پورا کرتے۔ آپ کے پاس محبت کا نقش اور کسی گم شدہ فرد کی بازیابی کا عمل اتنا مجرب تھا کہ اس تیر کا نشانہ کبھی خطا نہیں گیا۔ آپ نے ایسے کئی عملیات اپنی تفسیر میں بھی درج کیے ہیں۔ لیکن جب ان تعویذات کے ثمرات سامنے آتے تو لوگوں کو یقین دلاتے کہ یہ میرے درویشوں کی دعاؤں کا اثر ہے اور انہیں تلقین کرتے کہ

''حب درویشاں کلید جنت است!''

آپ ایک عالم دین تھے، پنجابی کے بے مثال شاعر تھے اور مفسر قرآن تھے۔ پھر مدرس تھے، معلم تھے۔ آپ کو تعویذات اور عملیات کو زیادہ وقت دینا گوارا نہ تھا مگر نقشبندی مجددی سلوک کی منازل طے کرتے وقت بعض بزرگانِ دین سے انہیں ایسے

فیضان سے حصہ ملتا تھا جسے وہ ضرورت مندوں اور پریشان حال لوگوں تک پہنچانے میں بخل نہیں کرتے تھے۔

آپ بزرگانِ دین سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی کرامات اور خرق عادات کو بڑے یقین سے بیان کرتے اور انہیں بزرگان دین کی کرامات پر کسی قسم کا شک وشبہ نہیں تھا۔ لاہور میں بے پناہ بزرگانِ دین کے مزارات ہیں آپ ان تمام بزرگان دین کے کمالات اور مکاشفات پر پورا یقین رکھتے تھے مگر انہیں حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصی عقیدت تھی۔

وہ حضرت شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کے کنویں کا پانی ہمیشہ اپنے حجرے میں رکھتے اور وقت ضرورت اسے پیتے۔ وہ ہر جمعہ کے پچھلے پہر حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر پیدل چل کر حاضری دیتے اور بڑھاپے سے جسمانی کمزوری اور نظر کی کمی کے باوجود اپنے کسی شاگرد کا ہاتھ پکڑتے، گرتے پڑتے حضرت سید ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر مراقبہ کرتے، فاتحہ پڑھتے، دعا کرتے اور وقت گزارتے مگر واپسی پر سواری حاصل کرتے اور گھر آتے۔ راقم نے آپ سے اس معمول پر ایک بار استفسار کیا کہ آپ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کی طرف اس وقت سورج کی دھوپ میں گرتے پڑتے حاضری دیتے ہیں مگر جب موسم ٹھنڈا ہو جاتا ہے، سورج پیچھے چلا جاتا ہے پھر سواری پر واپس آجاتے ہیں۔ آپ واپس جاتے وقت پیدل جایا کریں اور آتے وقت سواری پر آیا کریں۔ آپ نے فرمایا حاضری کے وقت پیدل افتاں خیزاں آنا چاہیے، واپس جس طرح چاہیں جائیں۔ آپ نے مجھے ایک بار بتایا کہ مجھے جب کوئی علمی مسئلہ درپیش ہوتا ہے اور کتابوں کے صفحات اس کے حل سے خاموش ہوتے ہیں تو میں حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر مراقبہ میں بیٹھ کر اس مسئلہ کا حل تلاش کرتا ہوں، حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ میری راہنمائی فرماتے ہیں مگر بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ میرے مسئلہ پر حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ اور

حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ نے باہم مل کر میری تسلی فرمائی۔ یہ مکاشفاتی احوال فاضل مؤلف کی صفائی قلب کے مرہون منت تھے۔

آپ کو اپنے طالب علم درویشوں سے بے پناہ محبت تھی، آپ ان پر اس قدر شفقت فرماتے کہ ان کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھتے۔ آپ بعض افراد سے صرف اس لیے کبیدہ خاطری کا مظاہرہ کرتے کہ وہ لوگ آپ کے درویشوں کا خیال نہیں رکھتے تھے۔ آپ اپنے درویشوں کو ہر طرح خودداری اور بے نیازی کی تربیت دیتے۔

ہر موسم کا پھل افراط سے منگوا کر درویشوں کے سامنے رکھتے، ہر دل پسند کھانا بڑی محبت سے درویشوں کو کھلاتے، آپ اپنی جیب خاص سے عمدہ کھانے پکوا کر اپنے درویشوں کی تواضع کرتے تاکہ آپ کے درویش کسی امیر کے دستر خوان یا اس کی امیرانہ طرزِ زندگی سے مرعوب نہ ہوں اور باوقار انداز سے رہنا سیکھیں۔

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ اسلامی تقریبات کا خصوصی اہتمام کرتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی خوشی میں عید میلاد النبی کو درود وسلام کے پھولوں سے سجاتے، نعت ومدحت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے گلدستوں سے نوازتے۔ گیارہویں کا ختم ہر ماہ اہتمام سے کراتے، خود زیادہ پڑھتے درویشوں سے تھوڑا پڑھواتے، مگر انہیں زیادہ کھلاتے۔ شب معراج، شب برات، لیلۃ القدر اور اپنے پیرومرشد کے سالانہ عرس کی تقریبات کو قصور میں بڑے اہتمام اور حسن وخوبی سے مناتے۔ آپ ان تقریبات میں درود وسلام، تلاوتِ قرآن پاک کا خصوصی اہتمام کرتے۔

(''جہانِ رضا'' اپریل ۱۹۹۷ء)
